قدرت کی اسپیس

حضور قلندر بابا اولیاءؒ

قدرت کی اسپیس

حضور قلندر بابا اولیاءؒ

پیش لفظ

سائنس صرف ایسی چیزوں کے بارے میں بات کرتی ہے جن کو چھوا جا سکے اور جن کا تجربہ ہو سکے۔ روحانیت کا مضمون صرف باطنی تجربوں کے ساتھ منسلک ہے مگر ان دونوں کے مابین ایک گہرا رشتہ ہے اور ان دونوں کا ارتقاء ایک دوسرے کے تعاون سے ہوتا ہے۔ یہ بات آج تک کسی نے کہی نہیں ہے۔

ایک مصنف یا مفکر صدیوں پہلے کوئی تخیل کرتا ہے۔ یہ تخیل اس کے دماغ میں دفعتاً آتا ہے۔ جب یہ اپنا خیال دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو لوگ اس پر ہنستے ہیں اور کچھ لوگ اس کو پاگل کی اختراع سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ صدیوں بعد جب کوئی سائنس دان اس تخیل کو مادی شکل دیتا ہے تو دنیا تعجب میں پڑ جاتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں سب سے پہلے وہ تخیل پیش کرنے والے کی تعریف کرنے لگتی ہے۔ ایسا کیوں؟ جس کو خیال آتا ہے وہی اس کو مادی شکل کیوں نہیں دے سکتا؟ اصل خیال صدیوں پہلے دنیا کے کونے میں بسنے والے آدمی کو آتا ہے، اور اس کو عملی شکل صدیوں بعد دنیا کے دوسرے کونے میں بسنے والا آدمی دینے کے قابل ہوتا ہے۔ جگہ اور وقت۔ اسپیس اور ٹائم۔ ہزاروں میل اور سینکڑوں برس کا یہ فاصلہ کیا حقیقت ہے؟ یا صرف ایک مایہ ہے۔

نیند میں، خواب میں، انسان چلتا ہے، بیٹھتا ہے، کھاتا ہے، کام کرتا ہے اور جاگنے کی حالت میں بھی وہی کام کرتا ہے۔ ان میں کیا فرق ہے؟ ماحول میں ایسا کچھ بھی موجود نہ ہو پھر بھی یکایک کوئی غیر متعلق بات یا فرد کیوں یاد آ جاتا ہے؟ جبکہ اس بات یا فرد پر سینکڑوں برس کا وقت گذر چکا ہوتا ہے۔

یہ سب باتیں قدرت کے ایسے نظام کے تحت ہوتی ہیں جس کا مطالعہ ہونا ابھی باقی ہے۔ ایک بالکل نئے اور انجانے مضمون پر چھوٹی سی کتاب ایسی ہے، جیسے پانی میں پھینکا ہوا ایک کنکر، لیکن جب اس سے اٹھنے والی موجیں کنارے تک پہنچیں گی تو کوئی عالم، سائنس دان یا مضمون نگار کے دل میں موجیں پیدا کریں گی اور پھر اس کتاب کا گہرا مطالعہ ہو گا۔

قلندر حسن اخریٰ محمد عظیم برخیا

عرض مترجم

ممثل کلیات، واقف اسرار کن فیکون، حامل علم لدنی، ابدال حق، حسن اخریٰ محمد عظیم برخیا، حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے یہ کتاب جناب علی حسین صاحب کو لکھوائی اور پہلی دفعہ یہ کتاب گجراتی زبان میں شائع ہوئی۔

میں نے اپنی پوری کوشش اس بات میں صرف کی ہے کہ ترجمہ کے مراحل میں اصل مفہوم ضائع نہ ہو۔ میں روحانی علوم کا یہ ورثہ جو کہ ابھی تک اردو زبان میں منظر عام پر نہیں آسکا تھا نوع انسان اور نوع جنات کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے سپرد کرتا ہوں۔

میں ہوں حضور کا ادنیٰ غلام

خالد نیاز اویسی

فہرست

یوم

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ میں نے دنیا کو چھ یوم میں پیدا کیا ہے۔ یوم کے معنی کیا ہیں؟ یوم حقیقت میں (ILLUSION) نظر کے دھوکے کو کہتے ہیں۔اس کے دو حصے ہوتے ہیں:

(CONCEPT) یعنی خیال اور دوسرا (CHROMOSOME) جسم۔یہ دو حصے چھ حصوں میں بٹ جاتے ہیں:

۱۔وہم

۲۔خیال

۳۔علم

۴۔حرکت

۵۔عمل

۶۔نتیجہ

کائنات کی تمام حرکت اس محور کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے۔

تمام کائنات جانور، نباتات، ندیاں، نالے، پہاڑ، زمین سب اس میں آجاتے ہیں۔یہ تمام چیزیں مختلف ہواؤں کی بنی ہوئی ہیں۔ ان ہواؤں کو ہم برقی رو یا بجلی کا بہاؤ (ELECTRIC CURRENT) سمجھیں۔یہ بہاؤ ایسا ہے جو جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ کا ایک دوسرے سے رشتہ قائم رکھتا ہے۔

یہ بہاؤ ہر شئے میں کام کر رہا ہے۔یہ بجلی کا بہاؤ یا برقی رو سب کی زندگی ہے۔یہ برقی رو روشنی ہے۔جو ایک طرف آنکھ کے ذریعے دماغ کے پردے کے اوپر اپنا عکس ڈالتی ہے اور دوسری طرف ہماری آنکھوں کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے وہ عکس بن جاتا ہے حالانکہ اس منظر کو ہم دماغ کے پردے پر دیکھتے ہیں اور جو منظر ہم دیکھتے ہیں وہ اسی برقی رو کا حصہ ہے جس کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں۔

دماغ کے خلیوں میں یہی برقی رو گھومتی ہے۔ اور اسی برقی رو کے ذریعے خیالات ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک خیال ہو یا مختلف خیالات کا مجموعہ سب اسی برقی رو کے ذریعے احساسات میں جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مادہ (خلیہ) کوئی حقیقت نہیں رکھتا بلکہ خلیے برقی رو سے بنتے ہیں۔ اگر کسی انسان کا دماغ نکال لیا جائے تو اس کے سر میں ایک خالی جگہ باقی رہ جائے گی مگر وہ تمام خلیئے جس رو کے بنے ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور کام کرتے رہیں گے۔ اس شخص کے احساسات اسی طرح قائم رہیں گے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کی حیثیت آخر میں ایک مائکروفلم کی سی ہو جاتی ہے اور اس شخص کی جو مائکروفلم ہوتی ہے اسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اس شخص کے سب احساسات قائم رہتے ہیں اور جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ سنتا ہے اور جواب بھی دیتا ہے اور دیکھتا بھی ہے مگر بولنے، سننے اور دیکھنے کی وہ (WAVE LENGTH) طول موج ہماری فہم تک نہیں پہنچتی۔

ہمارے فہم کے تناسب سے اس کے خیال، سامعہ یا باصرہ کی طول موج (WAVE LENGTH) کی فریکوئنسی یا تو بیس (۲۰) سائیکل فی سیکنڈ سے کم ہوتی ہے یا پھر اس کی فریکوئنسی بیس ہزار (۲۰،۰۰۰) سائیکل فی سیکنڈ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی چیز ایک جگہ رکتی نہیں ہے۔ یا تو وہ چیز اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے اور ہماری نظر کی (WAVE LENGTH) سے باہر نکل جاتی ہے یا پھر وہ اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ ہماری نظر کے طول موج میں وہ سا نہیں سکتی یا داخل نہیں ہو سکتی۔ طول موج برقی رو کا وہ حصہ ہے جسے ہماری عقل سمجھ سکتی ہے اور جس حصے کو ہماری عقل نہیں سمجھ سکتی اس کی طول موج الگ ہوتی ہے اور وہ بدل جاتی ہے۔ طول موج کے بارے میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ فرعون نے مصر میں جو پیرامڈ (PYRAMID) بنائے ہیں وہ انہوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر ایک، دو، تین، چار، دس، بیس کمروں کی شکل میں بنائے ہیں مگر ان کو بنانے میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کمرے کی جیومیٹریکل (GEOMETRICAL) شکل ایک جیسی رہے۔ اگر آج بھی کوئی ایسا مکان بنائے جس میں ویولینتھ کی فریکوئنسی ایک جیسی ہو تو اس میں پچاس ہزار سال، ایک لاکھ سال اور دس لاکھ سال تک لاش خراب نہیں ہوتی، نا تو وہ سڑتی ہے اور نا تو چمڑی سوکھتی ہے بلکہ وہ ویسی ہی رہے گی۔

عقل کبھی واحد نہیں ہوتی۔ وہ دہری (DUAL) ہوتی ہے۔ ایک ظاہر اور ایک باطن۔ ظاہر ہمارے شعور میں آتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمارے شعور میں نہیں آتا پھر یہ کہ عقل کے حصہ نہیں ہوتے لیکن اس کا ایک مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس کو اکثر لوگ چھٹی حس (SIXTH SENSE) کہتے ہیں۔

یہ چھٹی حس برقی رو کا مرکزی نقطہ ہے۔ دماغ کے ہر خلیئے کے مجموعے میں اس کا نقطہ ہوتا ہے۔ نقطے کے معنی یہ کہ دماغ کے ہر خلیئے میں روح (SOUL) یا (CONCEPT) ہوتا ہے جو اس برقی رو کا دوسرا حصہ ہے۔ اس حصے میں (رخ میں) ایک دوسرا حصہ یا رخ (CHROMOSOME) مادہ ہے جو اڑتالیس (48) نقطوں یا اڑتالیس (48) دائروں پر بنا ہوا ہے۔

کروموسوم کی تین اقسام ہیں۔ ایک وہ جو فرشتوں کو (SPIRIT) (جان) سے الگ کرتا ہے اکیلے بنتا ہے۔ اس کروموسوم میں جنسی خواہش نہیں ہوتی اور وہ روح کے ساتھ ازل میں پیدا ہوا اور روح کے ساتھ ابد تک رہے گا۔ یہ کروموسوم روح کی طرح عام آدمی کی نگاہ کو نظر نہیں آتا۔

دوسرا کروموسوم جنات کا ہے۔ اس میں جنسی خواہش اور تناسل دونوں ہوتے ہیں۔ اس میں فرق یہ ہے کہ جنات بھی عام آدمی کو نظر نہیں آتے اس کروموسوم کی زندگی محدود ہوتی ہے۔

تیسرا کروموسوم انسان کا اپنا ہے۔ اس میں جنسی خواہش اور تناسل دونوں نظر آتے ہیں اس کی زندگی بھی محدود ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ وہ نظر بھی آتے ہیں مگر روح نکل جانے کے بعد مٹی میں مل جاتے ہیں۔

حقیقت میں کروموسوم کو بھی (ILLUSION) نظر کا دھوکا کہنا چاہیئے۔ اس میں روح چھپی ہوئی ہوتی ہے جو پردے میں رہتی ہے۔ کروموسوم کی نظر اسے دیکھ نہیں سکتی۔ (CONCEPT) روح یا (SOUL) کی نظر البتہ خود کو دیکھ سکتی ہے مگر یہ دیکھنا باطنی ہے۔ باطن (INNER) میں دیکھنے سے مراد مستقبل میں دیکھنا ہے۔ ہر انسان کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک تجربہ خواب ہے۔ بہت سے خواب مستقبل میں اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح نیند میں دیکھے ہیں۔ بہت سارے خواب انسان بھول جاتا ہے۔ اکثر خواب اس طرح دیکھتا ہے جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتا۔ اکثر کواب الٹی شکل میں نظر آتے ہیں۔ خواب کی بھی بہت ساری اقسام ہیں پھر بھی یہ ایک ایسا تجربہ ہے جو باطن میں دیکھنے سے متعلق ہے۔

ایک دوسرا تجربہ کابوس (SOMNAMBULISM) کی بیماری کا ہے۔ جسے عام لوگ بیماری کہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ بیماری نہیں ہے۔ لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ حادثے کا خوف رہتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان سو جاتا ہے' نیند میں اٹھتا ہے' کپڑے بدلتا ہے' آفس جاتا ہے' چابی سے آفس کھولتا ہے' کرسی پر بیٹھتا ہے' کچھ نہ کچھ لکھتا ہے اور پھر گھر واپس آتا ہے۔ کپڑے بدلتا ہے' سونے کے کپڑے پہن کر سو جاتا ہے۔ مگر اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ یاد نہیں رہتا' یادداشت اس کا ساتھ نہیں دیتی کہ کیا کیا وہ سب بھول جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی یادداشت کے پردے پر سب کچھ ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اگر یادداشت کا فوٹو لیا جائے تو اول سے لے کر آخر تک سب تحریریں ملیں گی۔ ایک تجربہ تو یہ ہوا۔

ایک اور تجربہ دن میں باطن میں دیکھنا ہے جو کہ جاگنے کی حالت میں ہوتا ہے اسے مراقبہ کہتے ہیں۔ اگر انسان کے ذہن کو مراقبہ میں یکسوئی حاصل ہو جائے تو بہت ساری چیزیں نظر آتی ہیں۔ اور وہ اکثر مستقبل کے بارے میں ہوتی ہیں۔ مراقبے میں ایک خاص روشنی جو کہ نور سے ہٹ کر ایک دوسری روشنی ہوتی ہے اس ہی روشنی میں سب کچھ نظر آتا ہے مگر اس کے لئے یکسوئی حاصل ہونا اول شرط ہے۔ یہ بھی باطن میں دیکھنا ہے۔

ایک اور بھی تجربہ ہے کبھی کوئی شخص غیر ارادی طور پر ایک شہر سے دوسرے شہر چلا جاتا ہے ایسی مثالیں بہت ہی کم ہیں مگر ہوتی ہیں، ایسا تجربہ باطن میں دیکھنے سے ہوتا ہے ایک وقت کبھی نہ کبھی ایسا تجربہ ہوتا ہے اگر ایسا تجربہ ارادہ کر کے کیا جائے تو اس کے ساتھ شرط ہے کہ انسان آہستہ آہستہ اپنے بدن کو ہلکا کرے جو کہ باطن بینی سے متعلق ہے۔ ہلکا ہوتے ہوتے بدن بالکل ہلکا ہو جاتا ہے جیسا کہ روشنی۔ لیکن اس کے لئے بہت مشق اور ریاضت کی ضرورت ہے پھر انسان اپنے ارادے اور اختیار سے کسی بھی شہر میں جا سکتا ہے چاہے فاصلہ کچھ بھی ہو۔ اس کام میں صرف ایک سیکنڈ (یا وقت کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ جو کہ ہم کر سکتے ہیں) لگتا ہے۔ یہ بھی باطن میں دیکھنا ہے۔ دراصل باطن میں دیکھنا سوچ بچار سے ہوتا ہے۔ یہ سوچ انتہائی گہری ہوتی ہے۔ دماغ بہت ہی گہرائی میں کام کرتا ہے اور گہرائی کا تجربہ کرتا ہے۔ جیسے جیسے وہ گہرائی میں جاتا ہے اس کا بدن ہلکا ہوتا جاتا ہے اور غائب بھی ہو جاتا ہے اس کو روحانی اصطلاح میں "فتح" کہتے ہیں۔

حواس کا سکڑنا

دماغ کا ایک خاص گیٹ (MAIN GATE) ہے۔ اس کے اطراف میں اور (GATES) ہیں۔ وہ گیٹ کلوز ہو جانے سے دیگر (GATES) بھی کلوز ہو جاتے ہیں اور حواس سکڑنے لگتے ہیں سننے کے، دیکھنے کے، سونگھنے کے وغیرہ سب حواس سکڑتے سکڑتے اتنے سکڑ جاتے ہیں کہ بیماری بن جاتی ہے اور اکثر عضلات کا فالج ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی فرد ضدی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جو بات اس کے خیال میں ہے وہی ہونا چاہیے اور وہ دوسروں کی بات نہیں سنتا تو اس کے بھی حواس سکڑنے لگتے ہیں۔ یہ ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ اس کے حواس سکڑ گئے ہیں۔ ایسے شخص کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کو جو چیزیں اچھی ہیں، اچھی نہیں لگتیں یا پھر اس کے برخلاف جب وہ آواز سنتا ہے تو سریلی آواز بھی اسے اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ وہ نفرت کرنے لگتا ہے۔ یہ سب باتیں حواس کے سکڑنے کی نشانیاں ہیں۔ حواس کے سکڑنے سے چہرہ بھی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک بات ہے جس سے کہ بیماری پرکھی جاسکتی ہے۔ چہرے پر جیسی چمک ہونی چاہئے ویسی چمک نہیں رہتی۔ چاہے چہرہ کسی بھی رنگ کا ہو۔

علاج:

اس کا علاج یہ ہے کہ شہادت کی انگلی پر:

"ان اللّٰہ علی کل شئی قدیر"

پڑھ کر دم کریں اور انگلی کو کچھ (SECONDS) تک تالو پر پھیریں، اس طرح پھیریں کہ دماغ کے خاص گیٹ کو چھوئے۔ اگر پھر بھی کچھ سکڑن باقی رہے تو ایک بڑا پتلا بنائیں اور ایک مخصوص طریقے کے مطابق سوئیاں لگائیں ہر پن کے اوپر۔

"ان اللّٰہ علی کل شئی قدیر"

دم کرتے جائیں اور پن لگاتے جائیں۔ اس سے بیماری بالکل ختم ہو جائے گی، حواس بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اگر ذہن میں ارادہ کر لیں کہ بیماری ختم ہو جائے تو بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

دوسرا علاج:

ہر انسان (فرد) کے دماغ میں دو کھرب خلیئے ہیں۔ان دو کھرب خلیوں میں ہر خاص گیٹ کے اطراف پانچ اور(GATES)ہوتے ہیں۔اس طرح کل بارہ کھرب خلیئے ہوتے ہیں۔ خاص گیٹ وہ ہے جس میں وہم (CONCEPT)پرورش پاتا ہے۔اس کے ساتھ ایک اور گیٹ اوپن ہوتا ہے جو خیال کا ہے اور اس کے ساتھ تیسرا گیٹ کھلتا ہے جو حواس بن جاتا ہے' چوتھا گیٹ اوپن ہوتا ہے جس سے حرکت واقع ہوتی ہے۔

پھر سوچ کے عمل کا پانچواں گیٹ اوپن ہوتا ہے تو عمل وقوع پذیر ہوتا ہے اور جب چھٹا گیٹ اوپن ہوتا ہے تو نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔یہ چھ (GATES) دراصل ایک ہی گیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس میں (MAIN GATE) وہم ہے' اگر اس (MAIN GATE) کو کلوز کیا جائے تو دوسرا گیٹ (MAIN GATE) بن جاتا ہے۔یعنی وہ گیٹ جس میں عمل پرورش پاتا ہے اور خیال کے بعد فوراً نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔

وہم

وہم(شک۔DOUBT)میں پھنسنا نہیں چاہئے اس لئے کہ وہم تذبذب کو جنم دیتا ہے۔

انما امرہ اذا ارادشیئا ان یقول لہ کن فیکون

کسی بات کاارادہ کرتے ہی ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ وہم کا گیٹ شک پیدا کرتا ہے اس لیے وہم کا گیٹ کلوز رہنا چاہئے۔ اگر کسی شخص کے سر پر ہاتھ رکھ کر۔

ان اللّٰہ علی کل شئی قدیر

گیارہ مرتبہ پڑھا جائے اور دم کیا جائے اور تین مرتبہ اس طرح کیا جائے تو وہم کا گیٹ کلوز ہو جائے گا۔

وہم کے قریب نہیں جانا چاہئے اس لیے کہ وہ(DOUBT) پیدا کرتا ہے اور شک کی پرورش ہوتی ہے اور اس طرح ڈالی پہ ڈالی پھیلتی چلی جاتی ہے۔اس کا بڑھنا رکتا نہیں ہے،اللہ تعالیٰ شک کو ناپسند کرتے ہیں جو وہم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔

وہم کے بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ شیطان انسان کے لہو میں گھومتا ہے۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہم انسان کے خون میں ملا ہوا ہے۔شیطان انسان کے خون میں وہم کی شکل میں دورہ کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ شیطان آپ کا کھلا ہوا دشمن ہے۔

ہپناٹزم

حضرت جنید بغدادیؒ کے ایک مرید پر شیطان نے اس طرح حملہ کیا کہ ہر روز رات کے وقت ایک زرافہ لے کر اس کے گھر جاتا اور اس سے کہتا میں ایک فرشتہ ہوں تجھے جنت میں لے جانے آیا ہوں۔ زرافہ کی گردن میں جو رسی تھی اسے پکڑ کر ایک جگہ لے جاتا۔ وہ ایک جگہ ایک کوڑے کا ڈھیر تھی، حقیقت میں شیطان مرید کو ہپناٹائز کرتا تھا، کوڑے کے ڈھیر کو جنت کہہ کر اسے خوش کرتا اور طرح طرح کے پھل، میوہ جات اسے کھلاتا۔ حقیقت میں زرافہ، زرافہ نہ تھا بلکہ گدھا تھا۔

ایک دن اس مرید نے حضرت جنید بغدادیؒ سے یہ بات بڑی خوشی خوشی گوش گزار کی تو اس پر حضرت جنید بغدادیؒ نے اس سے فرمایا کہ آج جب وہ (فرشتہ ۔۔۔۔۔۔ شیطان) آئے تو فلاں آیت پڑھنا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ عمل جنت میں پہنچنے کے بعد کرنا۔ وہ مرید جب جنت میں پہنچا تو اس نے وہ آیت پڑھی تو دیکھتا ہے کہ جس پر وہ بیٹھا ہے وہ گدھا ہے اور جس جنت میں وہ پہنچا ہے وہ کوڑے کا ڈھیر ہے۔ دراصل یہ صرف وہم کا کرشمہ تھا۔ اسے انگریزی میں (ILLUSION) کہتے ہیں۔ آج کے دور میں بھی ہپناٹزم کا رواج ہے۔ لیکن ہر شخص ہپناٹائز نہیں ہوتا۔ مگر کچھ لوگ اس کے اثر میں آجاتے ہیں اور یہاں تک ہپناٹائز ہو جاتے ہیں کہ ڈاکٹر مریض کا آپریشن کر لیتے ہیں۔ ہپناٹزم کرنے کے یہ معنی ہیں کہ جو چیز بتائی جائے وہی ''معمول'' کو تسلسل میں نظر آئے۔

اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ عامل لوگ جب تماشہ دکھاتے ہیں تو معمول سے الگ الگ کام لیتے ہیں یعنی عامل کا ذہن اس وقت معمول کے اس گیٹ میں چلا جاتا ہے جن (GATES) کا رشتہ وہم سے ہے۔ ایک (GATE کے اطراف میں جو پانچ GATES ہیں ان کے مجموعے کو ایک ہی گیٹ مانا جائے گا)۔

قانون یہ ہے کہ پہلے وہم کا گیٹ اوپن ہوتا ہے لیکن دوسرا سوچ، تیسرا علم، چوتھا حرکت، پانچواں عمل اور چھٹا نتیجہ اور اس طرح پانچوں GATES کلوز ہو جاتے ہیں۔ عامل کچھ اس طرح ذہن پر زور لگاتا ہے کہ پونچوں GATES کلوز رہتے ہیں اور ایک گیٹ جو کہ وہم کا ہے اوپن رہتا ہے۔ وہم کے گیٹ کی نیچر (NATURE) ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہی دکھاتا ہے۔ اور جو کچھ وہ

دیکھتا ہے دراصل وہ دماغ دیکھتا ہے۔ وہم کے گیٹ میں جو کچھ بات ڈالی جائے وہی آنکھوں سے نظر آئے گی اس طرح ہپناٹزم ہوتا ہے۔ کسی بیمار کو ہپناٹائز کرنے والا عامل پہلے کسی چیز پر اسے یکسو کرتا ہے اور پھر (OPERATE) کر دیتا ہے۔

ہپناٹزم کرنے کے لئے محاورہ' عادت' مشق کرنی پڑتی ہے۔ تاش کے پتوں کو سامنے رکھ کر ان کو عامل بنائے اور خود معمول بن جائے۔ اگر وہ اکیلا ہو تو اسے بادشاہ کہے۔ جو بادشاہ دیکھ رہا ہے اس کا ذہن ایک طرف ہوتا ہے وہ آنکھیں نہیں جھپکاتا اس وجہ سے اس کے حواس سکڑ جاتے ہیں اور گیٹ کلوز ہو جاتے ہیں۔ اگر اس کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ اکا' اکا نہیں ہے۔ بادشاہ ہے تو بادشاہ ہی کو دیکھے گا۔

دوسری پریکٹس یہ کرے کہ ایک ایسی میز بنائے جس میں ڈھلان ہو۔ اس میز پر نمبر لکھے ہوئے گٹکے (پانسے) اس طرح پھینکے کہ اس کے ذہن میں ایک نمبر ہو۔ جب یہ پانسے ٹیبل پر پھینکے جائیں گے تو وہی نمبر بتائیں گے جو عامل کے ذہن میں ہوگا۔ لیکن یہ بات مشق سے حاصل ہوگی۔ پیراسائیکالوجی یا ہپناٹزم کی یہ دوسری مشق ہے۔

تیسری ورزش یہ کرے کہ ایک بچے کو معمول بنائے اور بچے کے اوپر اپنا ذہن مرکوز کرے۔ جب عامل کسی عورت کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے اس بچے سے کہے گا کہ تمہاری ماں جا رہی ہے تو وہ بچہ اس عورت کو اپنی ماں کی شکل میں دیکھے گا۔ دراصل ہپناٹزم اور پیراسائیکالوجی ایک ہی بات ہے۔

چوتھی مشق یہ کرے کہ کسی بڑے شخص کو معمول بنائے اور اس کے حواس اپنی گرفت میں لے اور اپنے ذہن کو اس کے وہم کے گیٹ میں داخل کر دے۔ اس طرح حواس کند ہو جائیں گے اور نتیجہ میں ذہن صرف ایک گیٹ کی طرف ہوگا اور اس گیٹ میں سارے حواس آجائیں گے۔ اب معمول وہی کرے گا جو اسے کرنے کے لئے کہا جائے گا۔

ذہن

انسان کا جاگتا ہوا ذہن (شعور) سامنے ہوتا ہے اور سویا ہوا ذہن (لاشعور) پیچھے ہوتا ہے۔ لاشعور میں ٹائم اور اسپیس، وقت اور جگہ بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کا سانس، شعور اور لاشعور کے بیچ میں گھومتا رہتا ہے۔ وہ اس طرح گھومتا ہے کہ شعور میں جاگتا ہے اور لاشعور میں جاگتا نہیں ہے۔ لاشعور کو جو علم حاصل ہے وہ شعور کو حاصل نہیں ہوتا۔ شعور اور لاشعور دونوں مسلسل ہیں۔

سانس ہمیشہ دائرہ کی شکل میں چلتا ہے۔ سانس کا دائرہ لاشعور میں پورا ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ دائرہ ٹوٹ جائے تو انسان مر جاتا ہے۔

سادھو لوگ لاشعور میں سانس کے دائرہ (CYCLE) کو قائم رکھتے ہیں اور شعور میں کوئی حرکت نہیں ہونے دیتے۔ اس طرح وہ اپنی زندگی میں اضافہ کر لیتے ہیں۔ سانس کو جتنا زیادہ روکا جائے گا، لاشعور کو اتنی ہی طاقت حاصل ہوگی۔ یعنی ذہن کے پردے کی رکاوٹ کم ہوتی چلی جائے گی۔ خواب میں یہ رکاوٹ اتنی کم ہو جاتی ہے کہ خواب نظر آنے لگتے ہیں۔

نیند جتنی گہری ہوتی ہے، مناظر اتنے ہی واضح (LUCID) ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ گہری وضاحت یادداشت کی مدد کرتی ہے۔ جو خواب یادداشت میں تحریر ہو جاتے ہیں وہ تحت الشعور (SUB CONSCIOUS) سونے والے کے ذہن کی سطح پر رہتے ہیں۔ جو مناظر گہرے نہیں ہوتے تحت الشعور کی سطح کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ کہنے کا منشاء یہ ہے کہ کچھ خواب یاد رہتے ہیں اور کچھ خواب یاد کرنے سے یاد آتے ہیں اور کچھ خواب یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتے۔ یہ وہ خواب ہیں جو تحت الشعور کی بہت ہی نچلی سطح میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

شعور ہمیشہ لاشعور سے آتا ہے۔ جو لاشعور کی کیفیتیں ہیں وہ شعور میں چلی جاتی ہیں مگر بہت ہی کم۔ لیکن جو کیفیتیں شعور سے لاشعور میں واپس چلی جاتی ہیں وہ یادداشت میں تحریر ہو جاتی ہیں اس کو بھی تحت الشعور کہتے ہیں۔ تحت الشعور، لاشعور کا ہی حصہ مانا جاتا ہے۔

لاشعور کو انسان محسوس نہیں کرتا۔ لاشعور میں ساری تحریر موجود ہوتی ہے یعنی انفرادی اور اجتماعی دونوں تحریریں لاشعور میں موجود ہیں۔ لاشعور میں پوری کائنات ہے ماضی' حال اور مستقبل تینوں زمانے اس میں موجود ہیں۔ درمیانی پردے کو آدمی کوشش اور ریاضت کے بغیر نہیں ہٹا سکتا۔

زہد کا جذبہ جتنا مضبوط ہوگا' لاشعور اتنا ہی قوی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ اللہ کے لئے تقویٰ اختیار کرنا، لاشعور کو طاقت دیتا ہے۔ آپ جتنا تقویٰ اختیار کریں گے لاشعور اتنا ہی قوی بنے گا۔ یہ روحانی لوگوں کا مسلک ہے جو زہد پر عمل پیرا ہیں۔ تقویٰ کے بغیر انسان کا پلڑا خالی رہتا ہے یعنی کہ تقویٰ کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس چھوٹے جملے میں کہ روزہ میرے لئے ہے تقویٰ کی ہدایت کی گئی یعنی کہ آپ جتنا تقویٰ اختیار کریں گے لاشعور اتنا ہی طاقتور ہوگا' روحانی لوگ تقویٰ پر عمل پیرا ہو کر طاقت حاصل کرتے ہیں۔

نیند ایک پردہ ہے' کسی نے اس پردے کو دیکھا نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ ایک خول کی حیثیت رکھتا ہے جو انسان کو ہر طرف سے ڈھانپ لیتا ہے۔ یہی پردہ خدا اور بندے کے بیچ میں آڑ بن جاتا ہے۔ دراصل ہم نیند کے خول کے نیچے چلتے پھرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جاگ رہے ہیں مگر ہم جاگتے نہیں ہیں۔ پردے کو کاٹنے کے لئے جاگتے رہنے کی مشق کرنی چاہئے۔ جاگتے رہنے سے آنکھوں پر سے نیند کا خول کٹ جاتا ہے۔

جب انسان نیند میں سے اٹھتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ جاگ اٹھا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ جاگا ہوا نہیں ہوتا وہ سویا ہوا ہی ہوتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے بھی سوتا ہے اور بند آنکھوں سے بھی۔ کھلی آنکھوں سے میری مراد جاگنے کی حالت ہے۔ اس کی تمام کیفیات وہی ہوتی ہیں جو جاگنے کی حالت میں ہوتی ہیں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ جاگنے کی حالت میں جو دیکھتا ہے۔ سنتا ہے اس کا سیاق وسباق کسی نہ کسی طرح پالیتا ہے لیکن جو باتیں وہ خواب میں دیکھتا ہے اور سنتا ہے ان کا سیاق وسباق ملانے کی اسے مشق اور عادت نہیں ہوتی۔

اس لئے جو باتیں وہ خواب میں سنتا ہے دیکھتا ہے۔ اسے بے جوڑ سمجھتا ہے اور ان باتوں کو خواب کہہ کر انکار کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان ایک خواب نیند میں بند آنکھوں سے اور دوسرا خواب کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے جس کا نام جاگنے کی حالت ہے۔

جب لاشعور بیدار نہیں ہے تو وہ خواب ہے۔ خواب میں عمر صرف کرنی بھی خواب ہے۔ پردے کے پیچھے وقت کا احساس نہیں۔

خواب میں پردے ہلکے ہو جاتے ہیں اس لئے انسان اسے دھوکا سمجھتا ہے حالانکہ اس حالت میں وہ دن رات ہوتا ہے۔

زندگی ایک خواب کی مانند ہے اس میں وقت نہیں ہے۔ مگر (جگہ) رفتار کو انسان وقت بنالیتا ہے۔یعنی کہ 23 سیکنڈ کے اندر اسپیس بدلتی ہے، اسی بدلنے کے فعل کا نام اس نے ٹائم رکھا ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ٹائم اسپیس کے ساتھ معلق ہے اور اسی لئے ہر اسپیس کا ٹائم الگ الگ ہوتا ہے۔

اسپیس

سائنس دان اسپیس ایسی خلاء کو کہتے ہیں جہاں زمین کی کشش ثقل (GRAVITY) موجود نہ ہو۔ زمین کی (GRAVITY) کس کس جگہ موجود نہیں؟ یہ ایک الگ بات ہے۔ زمین کی کشش کی وجہ سے انسان سانس لیتا ہے یعنی کہ ایک ایسی زندگی ہے جو کشش چاہتی ہے اور اس کے بغیر اس کا قیام ممکن نہیں۔ مگر زمین پر بسنے والے انسان، حیوانات، جمادات اور نباتات میں ہی کچھ ایسا موجود ہے جو زمین کی کشش کا اثر نہیں لیتا۔ مثال کے طور پر وہم' خیال' افسوس اس کے علاوہ سوچ تفکر وغیرہ بھی زمین کی کشش سے لاتعلق ہیں۔ اس کے بہت سے ثبوت موجود ہیں۔ مثال کے طور پر انسان سو جاتا ہے۔ کشش اس کو سانس پہنچاتی رہتی ہے مگر اس کا ذہن کشش سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، ایک سیکنڈ کے حصہ میں کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس حالت میں جو کیفیتیں اس پر گزرتی ہیں' یادداشت پر تحریر ہو جاتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے جاگنے کی حالت میں ہوتا ہے۔ یعنی اس کا ذہن جو کچھ دیکھتا ہے' سنتا ہے' سمجھتا ہے وہ زمین کی کشش سے آزاد ہے' اس کے سیدھے سادے معنی یہ ہوئے کہ سائنس کی یہ تعریف غلط ہے کہ اسپیس (SPACE) صرف خلاء کو کہتے ہیں۔ جہاں زمین کی کشش موجود نہ ہو جب کہ انسان ہر جگہ زمین کی کشش سے آزاد ہے۔ انسان صرف سانس لینے والے کا نام تو نہیں ہے، اس لئے کہ جب وہ نیند میں سانس لیتا ہے تو اسے کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ کریں گے کہ انسان سوچ بچار' تفکر یا توجہ کا نام ہے۔ یعنی صرف حواس کا نام انسان ہے۔ حواس ہی انسان کی زندگی ہیں۔ میں اس حالت کی تفصیل اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان چاہے زمین پر ہو یا خلاء میں وہ زمین کی کشش سے آزاد ہے۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اگر وہ زمین کی کشش کا پابند ہوتا تو کبھی مرتا نہیں۔ وہ ہمیشہ امر رہتا اس لئے کہ زمین کی کشش اس کی ہر کیفیت کو اپنے اندر سمو لیتی۔ روحانی دنیا میں اسپیس خلاء تک محدود نہیں ہے۔ مگر اسپیس ہر جگہ ہے' ہر چیز میں ہے اور کوئی چیز اسپیس سے الگ نہیں رہ سکتی۔

انسان کے ذہن میں جو پردہ ہے' اس کی چار جگہ (اسپیس) ہیں۔ ایک اندھیرا اور اندھیرے کے پیچھے کی اسپیس۔ ایک اجالا اور ایک اجالے کے پیچھے کی اسپیس، یہ چار اسپیس ہوئیں۔ انسان اگر چاروں اسپیس پر قدرت اور قابو پانا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اس طرح وہ اندھیرے میں دیکھ سکتا ہے اور اجالے میں پردے کے پیچھے جو کچھ ہے اسے دیکھ سکتا ہے۔ یہ جاگنے سے ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ہو جاتا ہے پہلے چوبیس گھنٹے' پھر اڑتالیس گھنٹے' پھر بہتر گھنٹے' پھر بہتر سے زیادہ چوراسی گھنٹے' عموماً بہتر گھنٹے کے بعد وہ چیزوں پر قابو پا لیتا

ہے جن پر قابو پالینا چاہے، مثال کے طور پر بہت سی اسپیس پر قابو پالیتا ہے معنی یہ ہوا کہ چاروں اسپیس دماغ کے پردے سے الگ ہو کر سامنے آ جاتی ہیں۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو مستقبل سے متعلق ہوتی ہیں۔ وہ الگ الگ ٹکڑوں میں نظر آتیں ہیں۔

آہستہ آہستہ انسان ٹکڑوں کو جوڑنے لگتا ہے۔ ٹکڑے جوڑنے کے بعد اسپیس میں کچھ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ پھر انسان اس کو سمجھنے لگتا ہے کہ مستقبل میں ایسے حالات پیدا ہونگے، آنکھوں کے ساتھ جب دماغ کے چاروں حصے بیدار ہو جائیں گے، حرکت میں آ جائیں گے تو سننے کی اسپیس بھی حرکت میں آ جائے گی اور جب اس طرح دونوں اسپیس مل جائیں گی تو انسان دیکھنے بھی لگے گا اور سننے بھی لگے گا۔ پھر سونگھنے اور چکھنے کی اسپیس مل جائیں گی۔ جب ان پانچوں اسپیس دیکھنا، سننا، سونگھنا، چکھنا اور چھونے کے ساتھ چھٹی سوچنے کی اسپیس مل جائیں گی تو بہت دور کی باتیں دماغ میں آتی ہیں، جو مستقبل میں ہونے والی ہوتی ہیں۔ اگر سوچنے کی اسپیس نہ ملے تو پانچوں حواس مل کر خیالات کو جنم دیتے ہیں۔ ان پانچوں اسپیس کے بارے میں انسان سمجھتا ہے۔ اس حالت کو "فتح" کہتے ہیں۔ اس کے اندر انسان کا بدن صرف ایک چھاؤں (سایہ) بن جاتا ہے اور وہ وقت اور فاصلہ کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس میں سوچنے کی اسپیس شامل نہیں۔ اگر سوچنے کی اسپیس شامل ہو جائے تو فتح میں کمزوری آ جائے گی۔ جسم بھاری ہو جائے گا مگر یہ پانچ اسپیس ملنے سے جو خیالات پیدا ہوں گے وہ سوچنا نہیں کہلائیں گے یہ تو صرف علم ہو گا جس میں انسان کا انفرادی ذہن شامل نہیں ہوتا۔ مگر یہ علم اسپیس کا ہوتا ہے۔ اس وقت جب انسان "فتح" کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کی اپنی فکر، اس کا اپنا سوچنا سب یادداشت سے نکل جاتا ہے۔ مگر وہ اسپیس کے علم سے سوچتا ہے یہ اسپیس کا علم اللہ کا نور ہے۔

سارے اولیاءاللہ کا قول ہے کہ ہم نے اللہ کو اللہ سے دیکھا، اللہ کو اللہ سے سمجھا اور اللہ کو اللہ سے پایا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اسپیس کا علم ملا ہوا ہے۔ اسپیس کا علم، علم کی تجلی کو دیکھتا ہے جب اسپیس کا علم آنکھوں سے دیکھ جائے، کانوں میں سنائی دے تو تجلی نظر آتی ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

وما كان بشران يكلمه الله الا وحب اومن وراى حجاب اويرسنل رسولا فيوحى باذنه يشاء

کسی کی طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرے مگر تین طریقوں سے وحی کے ذریعہ، رسول کے ذریعہ یا حجاب سے۔

یہ تینوں اسپیس ہیں۔

حجاب بھی اسپیس ہے۔

وحی اسے کہتے ہیں کہ جو سامنے منظر ہو وہ ختم ہو جائے اور پردے کے پیچھے جو منظر ہو وہ سامنے آجائے اور ایک آواز آتی ہے۔

فرشتہ کے ذریعہ یا رسول کے ذریعہ کے معنی یہ ہیں کہ فرشتہ سامنے آتا ہے اور اللہ کی طرف سے بات کرتا ہے۔

حجاب کے معنی یہ کہ کوئی شکل سامنے آتی ہے اور اس طرح بات کرتی ہے جیسے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے،

حجاب ہے۔

یہ وہ تین اسپیس ہیں جن کی تفصیل قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا سطور سے کی ہے۔ یہاں جو کچھ مزید کہنا ہے وہ یہ کہ ہر فرد کو یہ توفیق ملی ہے اور بشر سے مراد جو انسان آدمی کی شکل میں ہے وہ بشر ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں پردے کے پیچھے ہیں۔ پردے کے اوپر نہیں ہیں۔ جب تک پردہ اٹھتا نہیں ہے یہ تینوں طریقے بیدار نہیں ہوتے۔ یہ تینوں شکلیں اس صورت میں ظاہر ہوتی ہیں جب انسان پردہ کے پیچھے دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

وحی کے بارے میں یہ نہ سمجھا جائے کہ وحی صرف انبیاء پر آتی ہے وہ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ میں نے مریم کی طرف وحی بھیجی، میں شہد کی مکھی کی طرف وحی بھیجتا ہوں۔

شہد کی مکھی نبی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات قابل بحث ہے کہ حضرت مریم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس کے ساتھ پھل، پھول، انگور وغیرہ آتے تھے، جنہیں کھا کر وہ اپنی زندگی گزارتی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ عام وحی میں کھانے پینے کی چیزیں بھی شامل ہیں۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت مریم نبی نہیں تھیں۔ یہ جملہ قابل اعتراض تھا۔

اسپیس کی بات ہو رہی تھی۔ یہ سب چیزیں بھی اسپیس کہلائیں گی۔ انسان یا حیوانات یا جمادات یا نباتات سب اسپیس میں ہی ابھرتے ہیں۔ اسپیس میں حرکت کرتے ہیں اور جو چلتے پھرتے جانور ہیں۔ جن میں انسان شامل ہے وہ اسپیس میں سانس لیتے ہیں۔

ایسا کہئے کہ اسپیس کے اندر جڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے بدن کو اسپیس سے چھڑا نہیں سکتے۔ مگر ایک صورت ہے کہ وہ اسپیس کی دوسری سمت، ظاہری سمت سے باطنی سمت کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ:

"موتو انت قبل موت"

اب ہمارے سامنے مرنے کے بعد کی سمت آجاتی ہے۔ یعنی انسان ظاہری شکل سے باطنی شکل میں چلا جاتا ہے۔ جسے موت کہتے ہیں۔ اگر زندگی کے درمیان اس پر قابو پالیا جائے تو اس پر وہ راز کھل جاتا ہے جو مرنے کے بعد کھلتا ہے یا مرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اسپیس کی باطنی سمت میں برزخ بھی ہے، حشر بھی ہے، دوزخ بھی ہے، جنت بھی ہے اور اعراف بھی ہے۔ اسپیس کے

باہر جو سمتیں ہیں وہ سب سمتیں عالم ناسوت کے پردے میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ہم بولتے ہیں مگر مرنے کے بعد بول نہیں سکتے۔ تو یہ بولنا کہاں سے آتا ہے؟ یہ ایک الگ اسپیس ہے۔ ہم بہت ساری ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کا نام ہم زندگی رکھتے ہیں۔ ان کے بغیر ہم انسان کو لاش کہتے ہیں۔

مناظر

ہر چیز کے ڈائیمینشن اسپیس میں ہوتے ہیں چاہے درخت ہو، جانور ہو یا انسان ہو، پرندہ ہو، زمین ہو، سیارہ ہو، خلائی دنیا ہو کچھ بھی ہو وہ ہماری آنکھوں کی اسپیس اور مناظر کی اسپیس دونوں کو مل کر بنتا ہے۔

یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اندھیرے میں کچھ لوگوں کو کچھ مناظر نظر آتے ہیں۔ یہ مناظر اندھیرا اور آنکھوں کی اسپیس سے بنتے ہیں، کبھی کبھار مناظر دن میں جاگنے کی حالت میں بھی نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے مگر ہوتا تو ضرور ہے۔ اندھیرے میں یا اجالے میں یہ چیزیں پردے کے پیچھے نظر آتی ہیں۔ یہ ڈر، خوف، امید یا آس پر معلق ہیں۔ اگر کوئی شخص اکیلا جنگل سے گزرتا ہے اور کسی جگہ پر اسے اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں خوف کی اسپیس بن جاتی ہے۔ اسے اندھیرے میں ایسے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں جو ظاہری طور پر ہستی نہیں رکھتے۔ خوف کی اسپیس میں اتنی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے کہ جو شکل نظر آتی ہے وہ واضح اور ڈائی مینشن کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسی طرح امید کی اسپیس میں بھی ویسی ہی گہرائی ہوتی ہے جو جاگنے کی حالت میں اجالے میں واضح مناظر دکھاتی ہے۔

وہ امید کی اسپیس ہے جو نسلوں کو جنم دیتی ہے۔ درخت اور پتوں کو اگاتی ہے، سیاروں اور ستاروں کو آنکھوں کے سامنے لاتی ہے۔

امید کی اسپیس مقابلتاً خوف کی اسپیس سے زیادہ طاقتور ہے۔

جب ہمارے دماغ میں امید کی اسپیس پیدا ہوتی ہے تو بینائی نظر کو اس طرح پھراتی ہے کہ درختوں میں پھول اور پھلوں میں رنگ نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے درختوں میں پھول اور پتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس اسپیس میں ایک تسلسل ہوتا ہے۔ یہ تسلسل صدیوں تک قائم رہتا ہے، کبھی برسوں تک رہتا ہے، کبھی مہینوں تک رہتا ہے، کبھی گھنٹوں تک رہتا ہے اور کبھی منٹوں اور سیکنڈوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اگر امید کی اسپیس میں تسلسل نہ ہوتا تو دنیا میں تبدیلی نظر نہ آتی۔ اس کے برخلاف خوف کی اسپیس صرف پردے کے پیچھے بتاتی ہے، ذہن کے اوپر ایسا اثر کرتی ہے کہ سب حواس ایک طرف لگ جاتے ہیں۔ ایسی حالت جاگنے میں بھی ہوتی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ اس حالت میں تسلسل ہوتا ہے۔ خوف ایک اسپیس ہے جو ذہن کے اندر داخل ہو کر نظروں کو پھراتی ہے اور حواس کو مفلوج کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اس اسپیس میں جو کچھ ہے اسے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کو کھاتے ہیں، اس کو

پہنتے ہیں، اسی کو سونگھتے ہیں، اسی کو سوچتے ہیں، اس طرح اس کے اندر گم ہو جاتے ہیں، گم ہونے کے بعد ایک خاص بات ہوتی ہے کہ یہ اسپیس زمانہ حال سے کٹ جاتی ہے۔ کبھی مستقبل میں یا کبھی کبھار زمانہ حال میں بھی لے جاتی ہے۔ جہاں زمانہ حال میں لے جاتی ہے تو وہاں وقت کا فرق نہیں رہتا۔ صرف جگہ کا فرق ہوتا ہے۔ صرف جگہ بدل جاتی ہے، پھر وہ ایک ہزار میل ہو کہ دو ہزار میل جب کٹ کے ماضی میں جاتا ہے تو وقت اور فاصلہ دونوں بدل جاتے ہیں۔ پھر تو وہ ایک سو سال پہلے، یا پانچ سو سال پہلے یا ایک ہزار سال پہلے ہو، جب وہ مستقبل میں لے جاتی ہے تو وقت اور جگہ دونوں بدل جاتے ہیں اس اسپیس کی گہرائی میں اتنی بہت طاقت ہے کہ انسان پرانے زمانے میں یا آنے والے زمانہ میں عملی طور پر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک عمر گزار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر انسان ماضی میں چلا جاتا ہے۔ پانچ سو سال پہلے کے انسانوں میں کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا ہے، پھرتا ہے، شادی کرتا ہے مگر اس اسپیس میں تسلسل ہونا شرط ہے۔ جب تسلسل ہو جاتا ہے تو انسان ماضی یا مستقبل پچاس سے سو سال بھی گزار دیتا ہے مگر ماضی یا مستقبل دونوں سے جب واپس آتا ہے تو اسی سیکنڈ میں آتا ہے جس سیکنڈ میں گیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی اسپیس میں ٹائم نہیں ہے اور ہر اسپیس کا ٹائم الگ الگ ہے۔

خوف کی اسپیس سے مراد دنیا کا خوف نہیں ہے۔ آپ یہ بالکل خیال نہ کریں کہ اس کے دل میں دنیا کے نفع و نقصان کا خوف ہے۔ اسے اللہ کا خوف ہے۔ یعنی اس ان دیکھی طاقت کا خوف ہے جسے اس نے دیکھا نہیں ہے۔ دنیا کے نفع و نقصان کے خوف کو خوف نہیں کہتے۔ وہ تو ایک قسم کی کمزوری ہے جو دنیا کے نفع و نقصان کی صورت اپنا لیتی ہے۔ حقیقت میں خوف ان دیکھی طاقت کا خوف ہے۔ یہ خوف ہی ایسی اسپیس ہے جو انسان کو پردہ کے پیچھے لے جاتی ہے اور بہت سی چیزیں بتاتی ہے۔

عالم ناسوت میں (مادی دنیا) خوف کے اندر تسلسل بہت کم ہوتا ہے۔ مگر امید میں تسلسل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یادداشت دونوں حالتوں میں کچھ نہ کچھ کام کرتی ہے۔ یادداشت خود ایک الگ اسپیس ہے، جس میں خوف اور امید کے اندر مستقبل میں ہونے والی سب اشیاء کی تحریر ہوتی ہے۔ مگر سب چیزیں یادداشت واپس نہیں کرتیں۔ کبھی کبھار تو اچانک کوئی چیز یاد آ جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوشش کے باوجود بھی کچھ یاد نہیں آتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یادداشت کی اسپیس میں ارادے سے ہمیشہ ایسی حرکت نہیں ہوتی جس سے کہ سب تحریریں سامنے آ جائیں۔ اکثر اوقات گہرائی میں جب یادداشت کی اسپیس حرکت کرتی ہے تو اسے طاقتور محرک کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر طاقتور متحرک نہ ملے گا یادداشت کی اسپیس حرکت نہیں کر سکتی۔ نتیجتاً یادداشت وہ تحریر یا (RECORD) واپس نہیں کرتی جو موجود ہے۔ مگر ایک بات اور بھی ہے کہ یادداشت کی ایک ہی اسپیس امید کی حالت میں زیادہ تسلسل رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بات کے بعد دوسری بات، ایک واقعہ کے بعد دوسرا واقعہ اور ایک فعل کے بعد دوسرا فعل سامنے آتا رہتا ہے۔

جملوں کو جوڑنے والے دماغ کا گیٹ ان افعال کو جوڑ کر ایک معنی پیدا کرتا ہے۔اس معنی سے ایک قابل قبول بات پیدا ہوتی ہے۔

حالانکہ یادداشت میں ہر بات کا الگ الگ (RECORD) ہوتا ہے مگر دماغ کا گیٹ انہیں جملہ کی شکل دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ایک کتاب میں عموماً ایک مضمون ہوتا ہے یعنی کہ ہنر کے لحاظ سے ایک کتاب ایک مضمون کے بارے میں لکھی جاتی ہے، حالانکہ یادداشت کی اسپیس میں بہت سارے مضمون ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کتابوں میں ابواب رکھے جاتے ہیں جن میں پیراگراف ہوتے ہیں۔ دماغ کے (GATES) کتنے ہی خیالوں کو جوڑ کر ایک جملہ بناتے ہیں۔ یہ جملہ ایک محدود لمبائی کا ہوتا ہے۔اسے اس سے زیادہ لمبا کرنا دماغ کے گیٹ کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ایسے دماغ کے (GATES) جو دخان کی کیفیت پیدا کرتے ہیں ان کا اثر دھویں کی طرح پھیل جاتا ہے تو جہاں تک یہ دھوں پھیلتا ہے اور اس طرح پھیلتا ہے کہ حافظہ کو سمجھنے والا ذہن اسے پڑھ سکے اور سمجھ سکے،اس کے بعد بھی وہ تحریر اپنی جگہ قائم رہے۔

اگر وہ تحریر کو یادداشت سے ایک مرتبہ واپس لینا چاہے تو ملے گی اور اگر ایک ہزار دفعہ واپس لینا چاہیں تو بھی ملے گی۔اگر یادداشت تحریر کو واپس نہیں کرتی یا تو جملہ کا آگے بڑھانا مشکل لگتا ہے تو ذہن وقف کی علامت سے کام لیتا ہے جو اسے جملہ پورا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ یادداشت کی طاقت کو بڑھا کر جملہ میں تبدیل کرتے ہیں اور یادداشت اس جملہ کو پڑھ سکتی ہے۔ یادداشت کی اسپیس صرف یہ کام ہی نہیں کرتی مگر وہ اس اسپیس کے ریکارڈ کو طے کر کے جمع کرتی رہتی ہے۔اور مائیکروفلم کی شکل دے دیتی ہے۔

یادداشت کی اسپیس کا دیگر کام یہ بھی ہے کہ ضرورت پڑنے پر مائیکروفلم کو فوراً انلارج (ENLARGE) کر دے، پھر دماغ کا گیٹ جملہ کی صورت میں اسے پڑھ سکے۔ یادداشت کی اسپیس کا تیسرا کام اسے (GATES) میں تقسیم کرنا ہے یعنی وہ الٹا کرتی ہے، نتیجہ سے فعل میں لاتی ہے، فعل سے حرکت میں، حرکت سے احساس میں، احساس سے خیال میں اور خیال سے وہم میں۔ وہم میں آنے کے بعد وہ علامات وقف کی شکلیں لے لیتی ہیں اور اس جملہ کی منشاء صرف رنج یا خوشی کو بھول جانے کی ہوتی ہے۔

یادداشت کی اسپیس کا چوتھا کام یہ ہے کہ وہ وقف کی علامات وغیرہ کو وہم میں اور وہم سے خیال میں اور خیال سے احساس میں، احساس سے حرکت میں اور حرکت سے عمل میں تبدیل کرتا ہے، یہاں تک صرف ماضی کے ساتھ رشتہ ہے۔ ماضی یعنی کچھ سیکنڈوں پہلے کا زمانہ حال یہاں یادداشت کی اسپیس جو علامات وقف لگاتی ہے اس کے معنی صرف استعجاب اور سکوت اور خاموشی ہوتا ہے۔

یادداشت کی اسپیس کا پانچواں کام یہ ہے کہ وہ مستقبل کے متعلق خیالات کو چھیڑتی ہے اور پھیلاتی ہے۔ چھٹا کام یہ ہے کہ یادداشت چھٹی حس بھی پیدا کر دیتی ہے۔ جو اس طرف کے دماغ کے مختلف (GATES) کو جمع کرکے ایک جملہ بنا دیتی ہے۔

جس کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور اسی حس کو چھٹی حس (SIXTH SENSE) کہتے ہیں۔ یہ کوئی غیب کا علم نہیں ہے مگر ہر انسان میں اس طاقت کی ہستی موجود ہے۔ یہ صرف حافظہ کی اسپیس کا کرشمہ ہے۔

اسپیس کی تقسیم

قدرت نے جب کائنات کو بنایا تو میرا خیال ہے کہ سب سے اول قدرت نے کاربن (CARBON) کو بنایا۔ جسے قرآن پاک میں دخان کا نام دیا گیا ہے۔ مگر یہ دخان وہ دھواں نہیں جسے ہم دھواں کہتے ہیں مگر ایسا دھواں ہے جو نظر نہیں آتا۔

اگر قدرت اس دھوئیں کو نہ بناتی جسے ہم کاربن کہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شاید کائنات نہ ہوتی اور دوسری بات یہ ہوتی کہ قدرت شاید کائنات کی بنیاد کسی اور چیز سے ڈالتی۔ بہر حال یہ بات قدرت کو ہی معلوم ہے کہ اس نے کائنات کی بنیاد کے لئے کاربن کو کیوں پسند کیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس کی ایسی جالی بنتی ہے جو جالی باقی جتنے ایٹم ہیں ان کو پھیلا کر الجھا دیتی ہے۔ کاربن کی ہی جالی ہے جس میں تمام ایٹم جمع ہو جاتے ہیں، کاربن کے علاوہ کوئی ایٹم ایسا نہیں ہے جو اکیلا (INDIVIDUAL) نہ ہو اور الگ الگ نہ رہے۔ ٹیم الگ الگ رہنے کے یہ معنی ہوئے کہ کائنات کی کوئی صورت، کوئی شاخ، کوئی شکل باقی نہ رہتی۔ صرف چھٹے ایٹم یعنی کاربن نے دیگر ایٹموں کو جمع کر کے مختلف شکلیں بنائیں۔ اسی سے ہی الیکٹرون یا اس سے بھی چھوٹا حصہ اگر ہے تو وہ بھی جمع ہوا اور اس طرح جتنے بھی الیکٹرون یا پروٹان جو کچھ ہوں سب کو کاربن ہی جمع کر کے رکھتا ہے۔ کاربن کے علاوہ کوئی بھی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو کائنات کو اکٹھا رکھے اور کائنات کی ساخت میں کام کرے۔ یہ نہ بھولیں' یہ بات میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایٹم صرف ایک (BEHAVIOUR) ہے جو کہیں نہ کہیں ہوتا رہتا ہے۔ اسے واقعہ (EVENT) بھی کہہ سکتے ہیں۔ یعنی کہ درخت کا سامنے ہونا بھی ایک واقعہ ہے۔ کسی پہاڑ کا قدرت میں وجود پانا بھی ایک واقعہ ہے۔ کسی انسان یا جانور کا موجود ہونا بھی ایک واقعہ ہے۔ کسی ستارہ یا کہکشاں کا نظام، سیاروں کا نظام کا موجود ہونا بھی ایک واقعہ ہے۔

قدرت نے کائنات کی بناوٹ میں کاربن کو ہی کیوں استعمال کیا؟ اس کا علم قدرت کے علاوہ کسی کو نہیں ہے۔ اس طرح قدرت کے کروڑوں بھید چھپے ہوئے ہیں۔ جن کو نہ انسان جانتا ہے نہ سمجھتا ہے۔

موجودہ حالات کے مطابق جو کچھ بھی موجود ہے۔ اس کی بنیاد کاربن کے اوپر ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں ایٹم کو نسمہ (NASMA) کہتے ہیں۔ میں اسے ایٹم ہی کہوں گا اس لئے کہ نسمہ ہر فرد کی سمجھ میں نہیں آتا۔

جب کاربن کے ایٹم نے جال کی شکل اختیار کی تو کائنات کی بنیاد پڑی جسے سائنس دان نبیولا(NEBULA) کہتے ہیں۔ وہ در حقیقت کاربن ہی کا بنا ہوا ہے۔ جس قسم کے بھی ایٹم ہوں اور جتنے بھی ہوں۔ سب اسی کے اثر کے تحت ہیں، اس کاربن سے ایک نورانی شعاع نکلتی ہے جو کاربن سے الگ ہے۔ مگر کاربن کی وہ نورانی شعاع جسے سائنس دان فوٹان(PHOTON) کہتے ہیں۔

اس کا مخرج اور خاصیت ایک ہی ہے مگر اس کے راستے الگ الگ ہیں۔ کاربن جب نبیولا سے پھیلتا ہے تو مختلف قسم کے ایٹم بناتا جاتا ہے۔ اب یہ ایٹم اینڈرومیڈا(ANDROMIDA) تک فوٹان سے الگ نہیں ہوتے۔ مگر فوٹان کے ساتھ رہتے ہیں اور فوٹان میں اور ان میں فرق نہیں ہو پاتا۔ اینڈرومیڈا کی اسٹیج گزر جانے کے بعد ایٹم اور فوٹان الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ یہ بات آپ کو بتائی جا چکی ہے کہ تصوف میں ایٹم کو نسمہ کہتے ہیں اور تصوف میں فوٹان کو جو نام دیا گیا ہے وہ "عارض" ہے۔ یہ دونوں نام آپ کے کانوں پر اس لئے لائے گئے ہیں کہ آپ کو ساتھ ساتھ علم ہو جائے کہ تصوف میں یہ دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جن کے معنی فوٹان اور ایٹم پورے نہیں کر سکتے۔ مگر مثال دینے کے لئے مجبوراً فوٹان اور ایٹم استعمال کئے گئے ہیں۔ نسمہ ایٹم سے قریب تر ہے۔ تفصیل اس بات کی یہ ہو رہی تھی کہ انڈرومیڈا تک فرق نہیں نکالا گیا تھا کہ ایٹم اور فوٹان الگ الگ ہیں۔ فوٹان کے خواص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ڈائی مینشن نہیں ہوتے اور وہ اتنے تیز رفتار ہوتے ہیں کہ جہاں سے رواں ہوئے پل بھر میں کائنات کا چکر لگا کر واپس وہیں آ جاتے ہیں۔ یہ حقیقت میں عارض کی خاصیت ہے۔ فوٹان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ سائنس دانوں نے کیا فیصلہ کیا ہے، مگر عارض کے بارے میں یہ بات یقینی ہے کہ وہ جس جگہ سے جس پل میں چلتا ہے اسی پل میں کائنات کا دورہ پورا کر کے اپنی جگہ پہنچ جاتا ہے۔ فوٹان کی تعداد سے پوری کائنات بھری پڑی ہے۔ اب نسمہ کی بات کریں جسے ایٹم بھی کہتے ہیں وہ جب نبیولا سے چلتا ہے تو اپنے خواص ساتھ لے کر چلتا ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کائنات میں جتنے بھی ایٹم ہیں سب اس کے (BEHAVIOUR) ہیں یا یہ بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام ایٹم کاربن کی تقسیم سے بنتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھئے!

قرآن میں کاربن کی جگہ دخان لفظ استعمال ہوا ہے۔ دخان کو تصوف میں "روفان" کہتے ہیں، یہ سب کچھ میں نے لکھا ہے اسپیس کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ جب کاربن سے دیگر سینکڑوں ایٹم بنتے ہیں تو ان کے خواص بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس بات کا خیال رہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑی ہیں جسے دخان کہا گیا ہے یا کاربن کہتے ہیں یا روفان کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہی ایٹم کائنات کی تمام ضروریات پوری کرتا ہے۔

یہاں یہ فرق پھر بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ فوٹان میں ڈائی مینشن نہیں ہوتے۔ فوٹان ہر شئے کے آر پار گزر جاتا ہے۔ چاہے وہ چیز کتنی ہی ٹھوس کیوں نہ ہو یا پھر چاہے وہ پتھر ہو، دھات ہو، پانی ہو یا کیچڑ ہو، ہر چیز سے گزر جاتا ہے۔ اس راستے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

عارض کے اقسام بھی ہیں۔ کچھ اقسام میں بتا دیتا ہوں جو ضروری ہیں۔ ایک عارض وہ ہے جو کاربن سے الگ ہو کر نبیولا سے ملتا ہے۔ ایک عارض وہ ہے جو کاربن کو چھوتا ہے اور چھو کر الگ ہو جاتا ہے پھر اس کی لہر دوسری ہو جاتی ہے اور وہ دوسرے راستے کے اوپر چلتا ہے۔ جو بار بار کاربن کو چھوئے وہ تیسری لہر ہے اور اس کا راستہ بھی الگ ہے مگر وہ اس دائرے میں چلتا ہے جس دائرہ میں اول اور دوسری لہر کے عارض چلتے ہیں۔ ایک چوتھی قسم کے عارض بھی ہوتے ہیں جو کاربن کے ساتھ ہی چلتے ہیں اور ان کا کوئی راستہ معین نہیں۔ وہ اسی راستہ پر جائیں گے جس راستہ پر کاربن جائے گا۔

اب آپ کاربن کی تقسیم اور اس کی کچھ ذمہ داریوں کے بارے میں خیال کریں۔ کاربن سے جتنی قسم کے ایٹم بنیں گے وہ اس ہی نسمہ کی پیداوار ہیں جس کی تفصیل آ چکی ہے۔ اس کے جتنے بھی ایٹم بنیں گے سب کے ڈائی مینشن الگ ہوتے ہیں، پھر چاہے ان کی تعداد کچھ بھی ہو۔ سینکڑوں میں ہوں یا اس سے زیادہ۔ مگر ان میں ڈائی مینشن ضرور ہوں گے اور ان کے (BEHAVIOUR) کردار بھی الگ ہوں گے۔ صرف (BEHAVIOUR) ہی نہیں کیفیات (خواص اور اثر) بھی الگ ہوں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ یہ سب کاربن کی وجہ سے جمع ہوتے ہیں۔ کاربن اتنا حساس (SENSITIVE) ہوتا ہے کہ اپنی کشش کے لحاظ سے جیسے چاہے اور جتنے چاہے ایٹم جمع کر لیتا ہے۔ ان سے ایک شکل بن جاتی ہے اور وہ شکل بھی ڈائی مینشن رکھتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کاربن کے پیچھے قدرت کا ہاتھ نہیں ہے، کاربن قدرت کے ارادے کے ماتحت کام کرتا ہے۔

کاربن کی نسل

ایک ذات

کاربن قدرت کے طریقہ کار پر اتنی سمجھ بوجھ رکھتا ہے کہ وہ انہی ایٹوں کو جمع کرے گا جس سے اگر کیڑا بنے گا تو کیڑے کی نسل بھی انہیں ایٹوں سے بنے گی۔ یہ قدرت کا راز ہے کہ نسل میں ایک دوسرے کے عکس کیوں ہوتے ہیں؟ اس طرح جب کسی پرندے کو پیدا کرے گا تو انہی ایٹوں سے پیدا کرے گا جو ضروری ہیں۔ اور اسے بنانے والے ایٹوں کی ایک نسل تیار ہو جائے گی۔ جو وہ ایک کاربن کے مرہون منت ہیں۔

یہ جملہ معترضہ بیچ میں اس لئے آیا کہ آپ یہ نہ بھولیں کہ یہ سب اسپیس کی تفصیل ہے۔ یعنی کہ کاربن کی کیفیات سب کی سب اور کاربن کا کرشمہ اور تمام اشکال سب کے سب اس طرح استعمال ہوں گے کہ جس سے آدم بنتا ہے اور آدم کی نسل بنتی ہے یا درخت بنتا ہے اور درخت کی نسل بنتی ہے یا پودا بنتا ہے اور پودے کی نسل بنتی ہے۔

یہ تمام اشکال اسپیس کے اندر ہی پرورش پاتی ہیں اور اسپیس ہی ان کی کئی شکلوں میں ڈائی مینشن پیدا کرتی ہے۔ اگرچہ ان کے ڈائی مینشن ایٹم اور مالیکیول (MOLECULES) کے اندر ہوتے ہیں مگر ان کو اکٹھا کرنے والی اسپیس ہی ہے جس میں کاربن کی مدد بھی شامل ہوتی ہے۔ اسپیس اور کاربن جو ایٹم اور مالیکیول آدم کی بناوٹ میں استعمال کئے تھے انہیں کو آدم کی نسل کی بناوٹ میں بھی استعمال کرتے رہیں گے۔ یہ قدرت کی مصلحت ہے اور میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایٹم حقیقت میں ایک (BEHAVIOUR) ہے اور کاربن بھی اسی طرح برتاؤ کرے گا جیسے دوسرے ایٹم کرتے ہیں۔ کاربن چھٹا ایٹم ہے اور اس کا جال بنتا ہے۔ اس کے جال میں ایک طرف ایٹم قید ہوتا ہے تو دوسری طرف فوٹان بندش میں ہوتا ہے۔ آپ کو یہ یاد ہوگا جو بات میں نے پہلے بتائی ہے کہ عارض کی ایک قسم ایسی ہے جو کاربن کے جال کے ساتھ چلتی ہے۔ اب کاربن کا جال اور یہ عارض مل کر شاہد، مشہود ناظر اور منظور بنتے ہیں۔ اب جتنے عارض ہیں سب شہود، منظور کی شکل اپنا لیتے ہیں۔ مشہود۔ منظور سے

یہاں مراد خلاء یا منظر ہے جو ایک دوسرے کو الگ کرتا ہے۔ باقی جو ایٹم ہیں وہ کاربن کے جال میں قید ہیں۔ اب عارض جو خلاء کے جال کی شکل میں دکھائی دیتا ہے وہ بھی کاربن کے جال میں قید ہے۔ اب صرف وہ عارض کا میدان ہے جسے ہم خلاء یا اسپیس کہتے ہیں۔ مگر سائنس اس جگہ کو اسپیس کہتی ہے جہاں زمین کی کشش کام نہ کرتی ہو۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اور اس میدان میں ہر قسم کے عارض جمع ہوتے ہیں اور کاربن کے جال میں مقید ہوتے ہیں۔ انہی اینٹوں کے مجموعہ سے پہاڑ بنتا ہے۔ سمندر بنتا ہے، زمین بنتی ہے، مکان بنتے ہیں، درخت بنتے ہیں، جانور بنتے ہیں، انسان بنتے ہیں، یہاں تک کہ ستارے، سیارے اور سیاروں کے نظام بنتے ہیں، ہر اقسام کی چیزیں انہیں اینٹوں سے بنتی ہیں۔ پھر چاہے وہ قدرتی بنی ہوئی ہوں یا انسان کی بنائی ہوئی ہوں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں خود کو "احسن الخالقین" فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے علاوہ اور بھی خالق ہیں اور یہ انہی چیزوں سے متعلق ہیں جو انسان اور ایٹم کی بناوٹوں سے ہوتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ سب کے سب ایٹم کاربن کے جال میں قید ہیں اور جو عارض کے خلاء کی شکل میں نظر آتے ہیں وہ بھی کاربن کے جال میں جڑے ہوئے ہیں کیونکہ عارض میں ڈائی مینشن نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ نیچر (قدرت) میں مختلف شکلیں بناتا ہے۔ یہاں تک کہ شکلوں کی پوری نسل اس سے پرورش پاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک محل تھا، کچھ عرصہ کے بعد محل کی جگہ کھنڈر رہ گیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اس ہی کھنڈر کی جگہ ایک محل بن گیا۔ اس ہی طرح نسلوں کا بڑھنا ہے۔

اب رہے رنگ، یہ بالکل اسی طرح بنتے ہیں جیسے ایک منشور (PRISM) کے سامنے کھڑے رہنے سے انسان کے کپڑوں کا رنگ مختلف نظر آتا ہے۔ اگر کپڑے سفید ہوتے ہیں۔ انسان کی شکل و صورت بھی چھوٹی بڑی نظر آتی ہے حالانکہ اس قد کی نہیں ہوتی۔ مگر اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ جو قد ہمیں نظر آتا ہے وہی فرد کا اصل قد ہے۔ بالکل اسی طرح خلاء میں جتنے عارض موجود ہیں سب مل کر ایک میدان بناتے ہیں، یہ میدان ایک پرزم یا منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔

جب آپ اس میدان میں کھڑے رہ کر دیکھیں گے تو دور کی چیزیں چھوٹی اور نزدیک کی چیزیں بڑی نظر آئیں گی۔ اسی طرح نزدیک کی چیزوں کا رنگ الگ ہوگا اور دور کی چیزوں کے رنگوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور دیکھنے میں آئے گا۔ حقیقت میں یہ اسپیس کا کرشمہ ہے۔ حالانکہ ہم اسے صرف روشنیاں سمجھتے ہیں، کبھی ہمارے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ میدان ایک پرزم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اسے اجالا کہیں یا اندھیرا کہیں یا دونوں کی درمیانی حالت۔ اس طرح پرزم کی تین حالتیں ہوئیں۔ ایک روشن جس میں روشنی اور زیادہ روشنی ہوتی ہے۔ درمیانی حالت جس میں تھوڑی روشنی اور تھوڑا اندھیرا ہوتا ہے۔ تیسری حالت جس میں اندھیرا اور زیادہ اندھیرا ہوتا ہے۔ زیادہ اندھیرے میں ان دیکھی طاقت کے خوف کی اسپیس زیادہ ہوتی ہے۔ درمیانی حالت میں خوف کی اسپیس صرف اندھیرے کی حس میں ہوتی ہے اور وہ بھی کم اور روشنی کی حالت کم ہو یا زیادہ، دونوں میں امید کی اسپیس زیادہ ہوتی

ہے۔اس کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے۔وہ زیادہ تر سلسلہ وار ہوتی ہے۔اس کا سلسلہ وہاں ٹوٹتا ہے جہاں درمیانی حالت آئے یا تیسری حالت ہو جائے اور اس اسپیس کا نام نیند ہے۔اس اسپیس میں جو کچھ شاہد اور مشہود، ناظر اور منظور کے درمیان میں آتا ہے اسے خیال کہتے ہیں۔ حالانکہ ناظر اور منظور زیادہ ایٹموں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ایک اور صورت یہ ہے کہ ایٹم کے (BEHAVIOUR) میں جو کہ انڈے کی شکل میں ہوتی ہے، ایک (BEHAVIOUR) الیکٹرون ہے۔ وہ الیکٹرون جب اپنی حد سے باہر قدم رکھتا ہے اور اس کی جگہ باہر سے الیکٹرون آتا ہے تو نظر میں فرق آجاتا ہے۔یعنی کاربن کا جال پھیل جاتا ہے اور ایسا مسلسل ہوتا رہتا ہے۔اس کا اثر دماغ تک پہنچتا ہے۔دماغ کے (GATES) اس سے اوپن اور کلوز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جن خیالوں کے (GATES) کھلے ہوتے ہیں وہ بند ہو جاتے ہیں اور جو بند ہوتے ہیں وہ کھل جاتے ہیں۔اس طرح خیالات میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور انسان کی سوچ کے طریقے بدلتے رہتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک خیال قریب کا آیا اور ایک خیال بہت دور کا آیا۔اس میں ماضی اور مستقبل کی شرط نہیں ہے۔کچھ خیالات کا سلسلہ ماضی سے شروع ہوتا ہے اور زمانہ حال تک آتا ہے۔کچھ خیالات کا سلسلہ ماضی سے شروع ہو کر مستقبل تک پہنچتا ہے۔کچھ خیالات مستقبل سے ماضی کی طرف لوٹتے ہیں اور کچھ خیالات مستقبل سے ماضی کی طرف لوٹتے ہیں اور کچھ خیالات حال سے ماضی کی طرف آتے ہیں۔کچھ خیالات صرف ماضی میں مقید رہتے ہیں۔کچھ خیالات زمانہ حال میں مقید رہتے ہیں۔کچھ خیالات مستقبل میں مقید رہتے ہیں۔ یہ سب (GATES) کے اوپن کلوز ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ایک گیٹ سامنے کے خیالات کا کھلتا ہے تو فوراً دوسرا گیٹ ان خیالات کا کھلتا ہے جس کا پہلے گیٹ سے کچھ بھی رشتہ نہیں۔درمیان میں جو وقت لگتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں خیالات ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ بالکل تعلق نہیں رکھتے۔یہ کاربن کے اس جال کی وجہ سے جس میں عارض کا فاصلہ زیادہ ہے یعنی کچھ عارض ایسے ہیں جن کا تعلق آج سے سوا تین ہزار سال پہلے سکندر اعظم کے زمانے سے ہے اور دوسرے پل میں ہمارے اطراف جو عارض کے فاصلہ سے اتنا بڑا میدان بن جاتا ہے جو سکندر اعظم کے زمانے سے لے کر آج تک چھایا ہوا ہے۔آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ٹائم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ٹائم صرف دھوکا ہے' فریب ہے اور ٹائم اسپیس کے ساتھ منسوب ہے۔حالانکہ سکندر اعظم کے زمانہ کا جہاں تک تعلق ہے وہاں تک ایک اسپیس شاہد۔ناظر کو مل جاتی ہے اور ان ان چیزوں کا تصور کر سکتا ہے جو اس زمانہ میں تھیں یا ہو سکتی تھیں۔ بالکل جیسے کہ ایک آرٹسٹ ایک فرضی شخص بناتا ہے۔مگر ہم اسے شخص کہیں گے فرضی شخص نہیں کہیں گے۔اگر ایک گوشت پوست کا بنا ہوا گھوڑا آپ کے سامنے لایا جائے اور ایک گھوڑے کی تصویر تو آپ دونوں کو گھوڑا کہیں گے۔آپ ایسا نہیں کہیں گے کہ یہ گوشت پوست کا گھوڑا ہے اور یہ گھوڑے کی تصویر ہے یہ صرف اسپیس کا کرشمہ ہے۔یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اسپیس آپ کو یہی بتاتی ہے۔یہاں اسپیس سے مراد سوچنے کی اسپیس' دیکھنے کی اسپیس اور چھونے کی اسپیس

تینوں جمع ہو جاتی ہیں۔ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے تو سننے والا، دیکھنے والا کسی کو تعجب نہیں ہوتا اور نہ کوئی اعتراض کرتا ہے۔

ایک عارض سے دوسرے عارض کا فاصلہ کئی ہزار سال تک ہو جاتا ہے۔ اور ایک عارض سے دوسرے عارض کا فاصلہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کچھ سلسلہ وار عارض ہیں جو خیالوں کو ملاتے ہیں۔ جب ہمیں ایسا لگتا ہے کہ سکندر اعظم کے خیال سے یکدم ایک دوست کا خیال کیسے آیا؟ اس سے ہمیں بہت تعجب بھی ہوتا ہے کبھی کبھار ایک عارض کا فاصلہ دوسرے عارض میں اسپیس کے اندر اتنا ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانے سے اس موجودہ پل تک پہنچ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ فاصلہ لاکھوں برس کا ہو، مگر کاربن کے جال میں دونوں عارض ملے ہوئے ہوں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ ٹائم اسپیس سے منسوب ہے۔

ٹائم کا کوئی ڈائی مینشن نہیں۔ ہر اسپیس کا ٹائم الگ ہوتا ہے۔

ٹائم بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ فاصلہ جو وہ ایک ہزار سال میں COVER کرتا ہے اور وہ فاصلہ جو موجودہ سیکنڈ میں ہے ان میں صرف دو عارض کا فرق ہوتا ہے۔ یہ کاربن کے جال میں اسپیس کے اندر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ دماغ کے GATES کے اندر اتر جاتا ہے۔ جس وقت کا جو عارض ہے وہ اپنا وقت آگے کرتا ہے۔ پھر چاہے وہ وقت کروڑوں سال پرانا ہو۔ یہ کروڑوں سال اس عارض میں ریکارڈ ہیں۔ میں نے پہلے عارض کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ جس جگہ سے جس پل میں چلتا ہے اسی جگہ اس پل میں کائنات کا چکر پورا کر کے پہنچ جاتا ہے۔ اگر وہ ہمارے دماغ کے کسی گیٹ کے پاس سے گزرتا ہے تو اپنا زمانہ ہمارے حافظہ کی اسپیس میں چھوڑ جاتا ہے۔ دیگر الفاظ میں وہ ہمارے حافظہ کی اسپیس میں ریکارڈ ہو جاتا ہے اور جب ہم چاہتے ہیں تحت الشعور اسے واپس کر دیتا ہے یعنی ہمیں یاد آجاتا ہے۔

ہمارے سیاروں میں سورج کھربوں سال پرانا ہے۔ اس کے دو رخ ہیں، ایک ناظر اور ایک منظور۔ ایک طرف ہمارے دماغ کی نظر ہمارے دماغ کے پردے پر پڑتی ہے جو ایک رخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے شروع میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ کاربن کا جال پوری کائنات کو ڈھانپ لیتا ہے۔ یہ صرف حافظہ کی اسپیس ہے۔ یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ کاربن کے جال کے ساتھ حافظہ بھی بنتا ہے۔ ایک رخ پر کاربن کا جال ہے، دوسرے رخ پر حافظہ کی اسپیس ہے۔ یہ بات رہ جاتی ہے کہ کائنات کی حیثیت کیا ہے؟ اس بات کو خواجہ باقی باﷲ نے وحدت الوجود کہا ہے۔ یہ جملہ قابل اعتراض ہے۔ میں نے درمیان میں یہ بتایا تھا کہ تاکہ لوگوں کا ذہن وحدت الوجود کو سمجھ سکے۔

سمتیں نہیں ہیں

یاد رہے کہ اسپیس میں کوئی سمت نہیں ہے جیسا کہ ہمیں لگتا ہے۔ مثال کے طور پر جنوب، شمال، مشرق، مغرب، اوپر، نیچے وغیرہ ہمارے وسوسے کی پیداوار ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لاشرقیہ ولاغربیہ

ان الفاظ میں سمتوں کا انکار ہے اور وہ ہمارے تخیل کا ہی نتیجہ ہیں ایسا بتایا گیا ہے۔ حقیقت میں ہم غلط سمجھتے ہیں کہ اسپیس میں کوئی سمت موجود ہے۔ اب آپ یہ سوچیں گے کہ ایک عارض ایک ہی وقت میں چھ سمتوں میں پھرا کرتا ہے اور کائنات کی چھ سمتوں کو (COVER) کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال ریڈیو موجود ہے۔ اس میں دو سیٹ ہوتے ہیں ایک سیٹ آواز کو بجلی کی لہروں میں تبدیل کرتا ہے اور دوسرا سیٹ بجلی کی لہروں کو آواز میں تبدیل کرتا ہے۔ یہ دونوں سیٹ ایک جگہ پر نہیں ہوتے مگر ایک ٹرانسمیشن اسٹیشن ہوتا ہے اور ایک ریڈیو (RECEIVER) ہوتا ہے۔ جب ہم بولتے ہیں تو ٹرانسمیشن اسٹیشن اسے ایسی لہروں میں تبدیل کرتا ہے جن کا تعلق کاربن والے فوٹان سے ہوتا ہے اور وہ چھ سمتوں پر پوری کائنات کا کونہ کونہ (COVER) کر لیتا ہے۔ یعنی کوئی نقشہ ایسا نہیں رہتا جس پر عارض کا اثر نہ ہوا۔ اثر سے مراد ریکارڈ ہے جو سننے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتا ہے۔ ریکارڈر یسوینگ سیٹ کے عارض سے ٹکرا کر ساری کائنات میں پھیل جاتا ہے اور ہم جہاں چاہیں سن سکتے ہیں، حقیقت میں یہ ایک اسپیس نہیں مگر دو ہیں۔ ایک سننے کی اسپیس ہے اور ایک بولنے کی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس میں وقت موجود نہیں۔ بولنے کی اسپیس کے ساتھ جب تک سننے کی اسپیس ایک رہتی ہے وہاں تک ہمیں سنائی دیتا ہے۔ جب دونوں اسپیس الگ الگ ہو جاتی ہیں تو ہم سن نہیں سکتے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر فرد کے سننے کی اسپیس الگ ہے۔ چاہے اس میں کتنے ہی افراد ہوں یا ایک پورا گروہ ہو۔ جب تک سب کی سننے کی اسپیس ایک ہے تو سب سن سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی قابل غور بات ہے کہ بولنے کی اسپیس اگر زیادہ ہو یعنی ایک فرد سے زیادہ

انسان بول رہے ہوں تو وہ اسپیس کو فرد یا گروہ کے سننے کی اسپیس پکڑ میں نہیں لا سکتے۔ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دونوں اسپیس سننے کی اور بولنے کی الگ الگ ہیں۔ یہ اسپیس جس طرح الگ الگ ہیں اسی طرح دیگر سب اسپیس بھی الگ الگ ہیں۔ پھر چاہے نیند ہو چاہے جاگنے کی حالت۔

جب نیند یا جاگنے کی حالت میں کچھ اسپیس اکٹھی ہو جائیں تو انسان پردے کے پیچھے دیکھنے لگتا ہے۔ کچھ اسپیس اکٹھی ہو جانے سے مراد دیکھنے کی اسپیس، سننے کی اسپیس، سونگھنے کی اسپیس، چکھنے کی اسپیس، بولنے کی اسپیس اور سوچنے کی اسپیس وغیرہ ہیں۔ جب یہ سب اسپیس اکٹھی ہو جائیں تو ایک ایسی اسپیس بنے گی کہ جو دماغ کے (GATES) کو کھول دیتی ہے۔ جو پردے کے پیچھے دیکھ سکتی ہے۔ شروع شروع میں یہ غیر ارادی طور پر ہوتا ہے، مسلسل نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اپنے ارادے کے تحت دیکھنے لگتا ہے اور ان GATES کی آواز جو اوپن ہوں، سمجھنے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ ان GATES کو کھولنے کی طاقت بھی حاصل کر لیتا ہے جو GATES جملے بناتے ہیں، انہیں انسان سنتا ہے، دیکھنے والی اسپیس میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ شروع شروع میں جو کچھ اسپیس کے اندر ہے وہ الگ الگ دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر مسلسل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے سن بھی رہے ہوتے ہیں۔ اب اسے ماحول میں کاربن کی اسپیس کے اندر فرشتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر کاربن کی مقدار کم ہو تو الگ الگ فرشتوں کو وہ دیکھتا ہے۔ ان کی بات چیت اس کے کان میں آتی ہے اور "جو یہ" یعنی مترجم اس فرد کی زبان میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہے۔

یہ بات نوٹ کر لیں کہ جتنے رنگ ہمیں ماحول میں یا درختوں میں یا جانور میں یا انسانوں میں یا مٹی میں نظر آتے ہیں وہ سب کے سب کاربن کے ہی رنگ ہیں، جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ کاربن اور عارض کا میدان مل کر ایک قسم کا (PRISM)(منشور) بن جاتا ہے۔ یہ رنگ سچے نہیں ہیں مگر پرزم کی کاریگری ہیں۔ دیگر الفاظ میں یہ کہ کاربن اور عارض مل کر جو میدان تیار ہوتا ہے۔ اس میں رنگ ہی رنگ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ وہی رنگ ہیں جو ہمیں نظر آتے ہیں۔ رنگوں کا دارومدار ان ایٹموں پر ہے جو اکٹھے ہو گئے ہیں اور ڈائی مینشن بھی انہی ایٹموں کی مقدار سے متعلق ہوتا ہے جو اکٹھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی فرد کی آنکھیں بڑی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس شخص کی آنکھوں کے کاربن اور عارض سے جو اسپیس بنتی ہے وہ زیادہ ہے یعنی کہ ایٹموں کا جتھہ (CLUSTER) بڑا ہو گیا ہے اگر کسی شخص کی آنکھیں چھوٹی ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ اسپیس کم ہے۔

دانتوں کی اسپیس کا دارومدار بھی ایٹموں کی تعداد پر ہے۔ ان کی سختی یا نرمی، بڑا ہونا یا چھوٹا ہونا اس بات سے متعلق ہے کہ اس میں ایٹموں کی تعداد کتنی صرف ہوئی ہے۔ اگر کسی فرد کے دانت نہیں ہیں تو اس کے منہ کے مزہ میں فرق آ جائے گا۔ اگر سب دانت مصنوعی ہیں تو اصل مزہ نہیں آ سکتا۔ جو اصل دانتوں سے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصلی دانتوں کے مسوڑھوں میں ایٹموں کا

مجموعہ ہوتا ہے، مگر مصنوعی دانت اپنے ایٹوں کو مسوڑھوں سے کچھ نہ کچھ حد تک الگ رکھتے ہیں۔ جس سے ایک GAP پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصل مزہ جاتا رہتا ہے۔

یہی مسئلہ کان کے ساتھ ہے' کان کے اندرونی پردے پر جو ایٹم روئین کی شکل اختیار کرتے ہیں اگر کسی وجہ سے وہ کمزور ہو جائیں یا ضرورت سے زیادہ موٹے ہو جائیں تو جھنجھناہٹ (VIBRATIONS) میں خامی آجائے گی اور سننے میں یا تو رکاوٹ ہو گی یا بالکل نہیں سنا جا سکے گا۔

اس سے یہ ہو گا کہ GATES نے سن کر حافظہ میں جو ریکارڈ جمع کیا ہے وہ سسپینڈ (SUSPEND) ہو جائے گا یا رک جائے گا اور نتیجہ کے طور پر حافظہ اس ریکارڈ کو واپس نہیں دے گا جو دماغ کے پردے پر اتنا ہلکا آتا ہے کہ دماغ کے حواس اسے پڑھ نہیں سکتے اور زبان اسے بول نہیں سکتی۔ ایسا شخص گونگا، بہرہ کہلاتا ہے۔ اگر بہرہ پن کسی طریقہ سے دور کیا جائے تو وہ بولنے بھی لگ جائے گا۔ یہ علاج ذرا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔
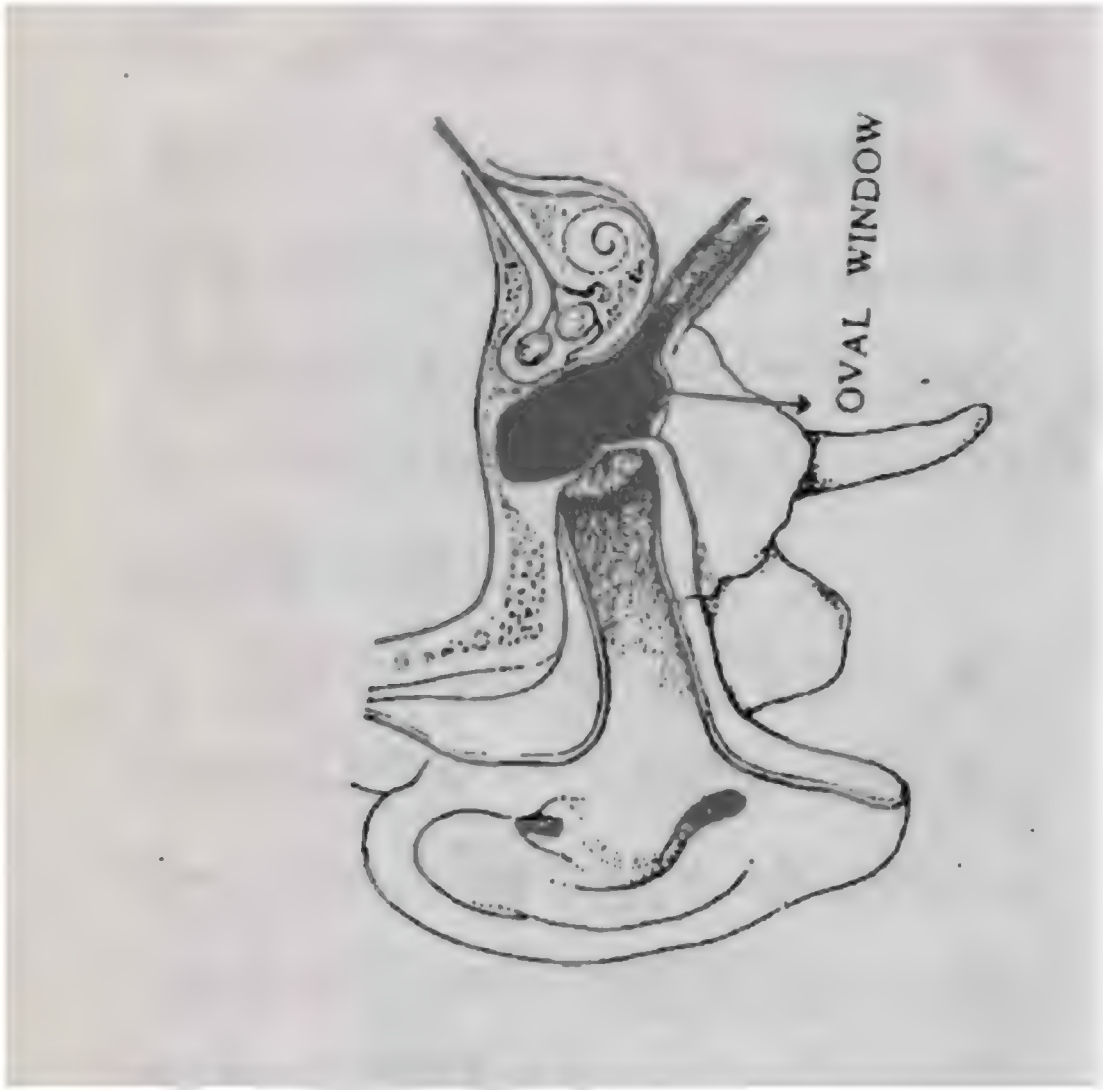
علاج:

ایک کاغذ پر کان کی پوری تصویر بنائیں۔ بیچ میں جس جگہ پر سوراخ (OVAL WINDOW) ہے اسے کاٹ دیا جائے۔

اب جتنی جگہ کاٹی گئی ہے اس سے تھوڑا بڑا کاغذ کا ٹکڑا لے کر اس ٹکڑے کے اوپر بالکل قریب قریب نقطے لگائیں۔ چاہے پنسل سے چاہے قلم سے۔ اب اس ٹکڑے کو سوراخ کے نیچے رکھ کر گوند سے چپکا دیں۔ پھر دونوں کان کاغذ پر چپکا کر ایک لفافہ میں ڈال دیئے جائیں۔ اس لفافہ کو بٹر پیپر (BUTTER PAPER) کی تھیلی میں ڈال کر بٹر پیپر کا منہ بند کر دیا جائے۔ (قبر جیسا بنا لیا جائے) اور اسے گونگے، بہرے شخص کے تکیے کے نیچے رکھا جائے جب وہ شخص لیٹے یا سوئے تو اسی تکیہ پر اپنا سر رکھے۔ انشاء اللہ کان ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور (SUB CONSIOUS) کا ریکارڈ زبان بولنے لگے گی۔ خیال رہے کہ یہ سب اسپیس کان، ناک، ہاتھ، زبان وغیرہ نہیں مگر ایک سایہ جو نورانی ہے اور نظر نہیں آتا۔ اس سایہ کو ہم چہرے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

ڈائی مینشن کاربن کی مقدار سے متعلق ہیں۔اس لئے کہ کاربن ایٹوں کو جمع کرتا ہے۔اس بات کا ایسے پتہ چلا کہ ہاتھ کی اسپیس حرکت میں نہ آئے یعنی کہ وہ سایہ جو کاربن کا بنا ہوا ہے اور نورانی ہے۔ہاتھ سے ایک بال بھر بھی الگ ہو جائے تو ہاتھ نکمہ ہو جائے گا۔بیچ میں جو خلاء ہے وہ خلاء اگر اسپیس کی شعاؤں کو روک دے تو حواس میں بدن کی حرکت رک جائے گی۔اس درمیانی چیز کو نسمہ کہتے ہیں۔جو بدن کے چاروں طرف ایک فٹ لگا ہوا ہے۔اگر آدھے بدن کے حصے میں اس کا اثر ہو جائے تو فالج کہلائے گا۔یہ بات مثال دے کر سمجھائی جا رہی ہے۔یونانی خواص کی بات چیت ضروری نہیں۔

اب یہ سمجھئے کہ انسان ہو یا جانور ہو یا درخت ہو یا پودا ہو یا کوئی ستارہ ہو یا کوئی سیارہ ہو، وہ کاربن ہی کا بنا ہوا ہے، یعنی اس میں ہزاروں تہہ ہوتی ہیں کبھی کبھار لاکھوں تہہ بھی ہوتی ہیں۔

کیڑا ایک چھوٹے سے چھوٹا جاندار ہے مگر وہ بھی ہزاروں تہہ کا بنا ہوا ہے۔یہ ساری تہیں اسپیس کی ہیں۔جس اسپیس میں کیڑے کا جسم ہے۔کیڑا وقت کا حساب لگاتا ہے۔پل دو پل، منٹ، دو منٹ، گھنٹے، دو گھنٹے، چار گھنٹے، چھ گھنٹے یا اس سے زیادہ مدت۔اس بات کو سمجھنے میں بہت باریکی ہے۔وہ ہر سیکنڈ میں دوسرا قدم، تیسرے سیکنڈ میں تیسرا قدم، چوتھے سیکنڈ میں چوتھا قدم اور پانچویں سیکنڈ میں جب قدم اٹھاتا ہے تو اب سمجھیں کہ وہ جوان ہو گیا۔سیکنڈ سے میری مراد وقت کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ ہے۔اب آپ اندازہ کریں کہ ہمارا چھوٹے سے چھوٹا وقت کیڑے کے چھوٹے سے چھوٹے وقت سے کتنا بڑا ہے۔کیونکہ ہماری اسپیس زیادہ ایٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ٹائم کی اس باریکی کو آپ ذرا سوچیں۔ہمارا بڑے سے بڑا وقت وہیل مچھلی کے چھوٹے سے چھوٹے وقت سے کتنا بڑا ہے۔شاید اب آپ وقت کی باریکی اور اس کا اسپیس سے رشتہ سمجھ گئے ہوں گے۔

دنیا کے اول دور میں ڈائناسار (DINOSAURS) اتنا بڑا جانور تھا کہ اس چھوٹے سے چھوٹے بچے کی معمولی خوراک یعنی کچھ لقمہ تھوڑے سے ہاتھی بنتے تھے۔مگر نتیجہ میں یہ زمین پر سے ختم ہو گئے۔اس لئے کہ ان کے رہنے کے لئے اسپیس نہیں تھی۔شروع شروع میں زمین پر جتنی اسپیس تھی وہ سب صرف ہو گئی۔جیسے جیسے ڈائناسور کی نسل بڑھتی گئی۔اسپیس کم ہوتی گئی اور نتیجہ کے طور پر ڈائنوسار ختم ہو گئے۔موجودہ دور میں بھی بڑے بڑے جانور آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں کیونکہ چھوٹے جانور اور انسانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔اب جتنی اسپیس ان کے استعمال کے بعد بچتی ہے اتنی اسپیس میں بڑے جانور پیدا ہوتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ان کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔مثال کے طور پر ہاتھی، گینڈا شیر وغیرہ وغیرہ۔آخر میں کوئی نہ کوئی جنگ ایسی چھڑے گی جس میں انسان اور چھوٹے جانوروں کی تعداد کم سے کم ہو جائے گی۔اس لئے کہ اسپیس میں جب ان کی گنجائش نہیں رہتی تو اسپیس کا قانون انہیں ختم کر دیتا ہے۔جیسے کہ بڑے جانور ختم ہو گئے۔

اسپیس کی وسعت

یہ تفصیل پہلے آچکی ہے کہ وقت بذات خود کوئی چیز نہیں ہے مگر اسپیس سے منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل قرآن پاک میں مختلف مثالوں سے بتائی ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ مثالیں غلط ہیں۔ اللہ عالی فرماتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور حوّا نے نافرمانی کی تو انہوں نے خود کو برہنہ محسوس کیا۔ معنی یہ ہوئے کہ وہ اعلیٰ اسپیس سے ادنیٰ اسپیس میں آ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ میرا ایک دن پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ میرا ایک دن دس ہزار سال کا ہوگا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ میرا ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا۔ اس میں وقت نہیں مگر اس کے برعکس اسپیس کی تفصیل ہے اور یہ پچاس ہزار سال، دس ہزار سال اور ایک ہزار سال اسپیس سے منسوب ہیں یعنی کہ ان کا اسپیس کے ساتھ رشتہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے "یوم" کے لفظ سے ان تمام اسپیس کی تفصیل کر دی ہے جو خوف اور امید سے بنتی ہیں۔ اس لئے کہ یہاں "یوم" لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مگر پورے سورۃ "قدر" میں جہاں لیلۃ القدر کا ذکر ہے وہاں اس کی مدت ایک ہزار مہینہ کے برابر بتائی گئی ہے۔ یہ مثال تو ہے مگر غلط نہیں۔ اس کے پردے میں بہت سارے بھید سمائے ہوئے ہیں۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن پاک کو شب قدر میں نازل کیا جب کہ قرآن پاک کو نازل ہونے میں تئیس (۲۳) برس لگے ہیں۔ اس میں اسپیس کا ذکر ہے۔ وہ اسپیس جس میں قرآن پاک نازل ہوا تئیس (۲۳) سال کے برابر ہے۔ یعنی ایک سال کے مقابلے میں تئیس (۲۳) سال کی مدت منسوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس (۳۰) راتوں کے لئے بلایا تھا اور چالیس (۴۰) راتوں تک کوہ طور پر رکھا۔ یہاں پر صرف راتوں کی اسپیس کا ذکر ہے۔ دن کی اسپیس ان میں شامل نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جب سوال کیا گیا کہ قیامت کا وقت کتنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

"اے رسول! ان سے کہہ دو کہ پلک جھپکنے کے برابر یا اس سے بھی کم۔"

اب یہ وقت بھی اسپیس سے منسوب ہے یعنی کہ اسپیس کی وسعت کے اعتبار سے وقت کی نفی ہے۔ ٹائم کی ہستی اسپیس کی وجہ سے ہے۔ اسپیس کی وسعت جتنی زیادہ ہوگی وقت اتنا ہی کم ہوگا۔ ٹائم کی بذات خود کوئی ہستی نہیں ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ناظر اور منظور، شاہد اور مشہود کا اسپیس کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ شاہد سے مراد ہماری آنکھیں جن سے ہم دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ایک ہی اسپیس کے دو حصہ ہیں اب حواس بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ حواس کی اسپیس الگ الگ ہوتی ہے، دیکھنے کی اسپیس میں ہم قریب کی چیزوں کو صاف دیکھتے ہیں اور دور کی چیزیں چھوٹی اور ہلکی نظر آتی ہیں۔ یا بالکل نظر ہی نہیں آتیں۔ ایسا کیوں؟ یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ اسپیس کی وسعت بہت ہی زیادہ ہے مگر وقت کی وسعت جو اسپیس سے منسوب ہے بہت کم ہے۔ اگر ہمارے ہاتھ میں اخبار ہے تو ہم آنکھوں کی اسپیس کا استعمال کر سکتے ہیں اور تیسری اسپیس بولنے کی شامل کر کے آواز سے پڑھ سکتے ہیں۔ اگر ہم آواز سے نہیں پڑھیں گے تو صرف پڑھنے کی اسپیس کا استعمال ہوگا۔ اگر چھونے کی اسپیس کچھ فاصلہ پر ہو تو آنکھوں کی اسپیس کو کیڑے مکوڑے نظر آئیں گے اور صحیح پڑھا نہیں جائے گا یعنی کہ حرفوں کی شکلیں غائب ہو جائیں

گی۔ اگر چھونے کی اسپیس مزید دور ہو جائے تو الفاظ بالکل غائب ہو جائیں گے اور اخبار کا صفحہ بالکل کورا نظر آئے گا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسپیس الگ الگ ہیں۔

دوسری مثال یہ ہے کہ گلاب کا پھول نظر نہیں آرہا ہے مگر اس کی خوشبو آرہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دماغ کا وہ گیٹ اوپن ہو گیا ہے جس کا رشتہ سونگھنے کی اسپیس کے ساتھ ہے۔ اس گیٹ کے کھلتے ہی گلاب کی خوشبو آنے لگتی ہے حالانکہ گلاب دور دور تک نظر نہیں آتا۔ ظاہری دنیا میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے حواس کے ذریعہ سے نظر آتا ہے۔ اگر کسی کے حواس میں خلل پڑ جائے تو اسے وہ چیزیں نظر نہیں آئیں گی جو ہمیں نظر آتی ہیں۔ یہ حواس انر سیلف (INNER SELF) سے آتے ہیں۔ انر سیلف کا دماغ سے ڈائریکٹ رشتہ ہو جاتا ہے اور دماغ کے (GATES) اوپن ہو جاتے ہیں چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں۔

انسان کھلی آنکھوں سے سو جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ (GATES) کھلے رہیں جو انر سیلف میں کھلتے ہیں تو انسان بالکل سو جاتا ہے اور گہری نیند آجاتی ہے۔ اسے زندہ رکھنے کے لئے قدرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ انسان کے انر سیلف کے (GATES) کے پردوں کو کھول دیتا ہے۔ (GATES) جو دو کھرب ہیں بارہ کھرب ہو جاتے ہیں یعنی ایک گیٹ کے چھ GATES بن جاتے ہیں وہ GATES جو وہم کی جڑ ہیں اور جن سے خیال، احساس، حرکت اور نتیجہ آتا ہے ان GATES میں ایک تو سامنے کا رخ ہے اور ایک پردے کا رخ ہے جو کھل جاتا ہے۔ نیند گہری ہو جاتی ہے اور خواب نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سیلف میں اتنی قدرت ہے کہ GATES کو سامنے سے اور پیچھے سے کھول سکتا ہے۔ ہر حس دہری ہے۔

جب یہ حواس اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان حواس میں ایک اور حس بھی ہوتی ہے جو پردے کے پیچھے کام کرتی ہے وہ چھٹی حس کہلاتی ہے۔ یہ ایسی حالت میں حرکت کرتی ہے جب کوئی فرد خود کو خوف، خطرہ میں محسوس کرتا ہے اور قدرت اسے زندگی بچانے کے لئے تنبیہہ کرتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب سیلف GATES کے دوسرے رخ سے کام لیتا ہے اور سامنے کا رخ چھوڑ دیتا ہے۔

جب شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تو یہی صورت واقع ہوئی تھی۔ جیسے ہی آدم علیہ السلام بہکے ان کی اسپیس بدلی اور حواس میں تبدیلی آگئی۔ پھر آدم علیہ السلام اور حوا کو محسوس ہوا کہ وہ برہنہ ہیں۔

حقیقت میں ان کا انر سیلف اس خیال کو سامنے لے آیا جو پردے پر ہوتا ہے۔ یہ نافرمانی کی وجہ سے ہوا یعنی کہ نافرمانی کی بھی ایک اسپیس ہے جو کبھی چھوٹی اور کبھی بڑی ہوتی ہے، مگر یہاں دماغ کے GATES میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں ہم نے اس خیال کو اسپیس کہا ہے کہ حالانکہ اسپیس کا رشتہ احساس سے DIRECT ہے۔ جیسا کہ ٹائم اسپیس سے منسوب ہے۔ اسی طرح حواس بھی اسپیس سے منسوب ہیں۔ اس لئے حضرت آدم علیہ السلام اور جنابِ حوا کو احساس ہوا کہ ہم برہنہ ہیں۔ کیونکہ ان کے حواس بدل چکے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ:

"آپ سب اتر جائیں۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس اسپیس میں آپ آگئے ہیں وہ جنت کے لائق نہیں ہے۔ یہ عالم ناسوت (مادی دنیا) کی اسپیس ہے۔ اس لئے آپ سب جائیں۔ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آئے، اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انہیں احساس ہوا کہ ہم برہنہ ہیں۔ زمین کی اسپیس میں ہیں۔ اس لئے کہ انہیں عالم ناسوت میں یعنی کہ زمین کی اسپیس میں بھیجا گیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس اسپیس میں آنے پر بہت رنج ہوا، انہوں نے توبہ کی، روئے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے کہ اعلیٰ اور ادنیٰ اسپیس میں کتنا فرق ہے۔ وہ سکون جو انہیں جنت کی اسپیس میں تھا وہ ادھر چھین گیا اور بار بار اس سکون کے بدلے تکلیف کا احساس ہوتا تھا، اس لئے جوانی بیتی، بڑھاپا آیا اور اس کے بعد موت آئی یہ سب تبدیلیاں عالم ناسوت کی تھیں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو نبی کی حیثیت میں ان تمام تبدیلیوں کا احساس نہیں تھا تو ہم اس بات کو قبول نہیں کرتے۔ انہیں ایک رنج تو نافرمانی کی اسپیس کی وجہ سے ہوا اور دوسرا عالم ناسوت کی ادنیٰ اسپیس سے کہ غلطی میں پھنس کر اعلیٰ اسپیس سے رشتہ ٹوٹنے کی وجہ سے ہوا۔ ان کو اس اسپیس میں داخل ہونا پڑا جو موت کے بعد کا ہوتا ہے۔ یہ مثال اسپیس کی حس، حواس کے ساتھ منسوب ہونے کی ہے۔

ایک پروانہ چھ گھنٹے میں اپنی زندگی کے تمام مراحل طے کر لیتا ہے۔ جو وہیل مچھلی ایک ہزار سال میں طے کرتی ہے۔ یہ مثال حواس کے اسپیس کے ساتھ منسوب ہونے کی ہے۔ یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم ٹائم اور اسپیس سے اسپیس کا ناپ لیتے ہیں۔ ہمارے سامنے بلی کی مثال موجود ہے۔ بلی دن میں اور رات میں یکساں دیکھتی ہے۔ اس کے لئے اجالہ اور اندھیرا دونوں برابر ہیں۔ یہ اس لئے کہ اس کی آنکھوں کی اسپیس الگ ہے۔ ایک سانپ جس کی اسپیس معمولی ہوتی ہے ایک بڑے چوہے کو نگل جاتا ہے اور ہضم کر جاتا ہے۔ یہ بھی اسپیس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر چوہا اسے اتنا بڑا نظر آئے جتنا ہمیں نظر آتا ہے تو وہ اسے نگلنے کی ہر گز ہمت نہ کرے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ وہ بغیر کسی جھجک کے چوہے کو پکڑتا ہے اور نگل جاتا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ چوہا سانپ کو اتنا بڑا نظر نہیں آتا جتنا بڑا ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ بھی حواس کے اسپیس کے ساتھ منسوب ہونے کی مثال ہے۔ صرف آنکھوں کی نہیں مگر سوچنے کی اسپیس بھی منسوب ہے اور ہضم کرنے کی اسپیس بھی منسوب ہے۔

ہمیں کچھ انسان چھوٹے قد کے نظر آتے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ یہ چھوٹے قد کا انسان ہے اور یہ بڑے قد کا انسان ہے۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ چھوٹے قد کا انسان بڑے قد کے انسان سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ پہلوانوں میں کشتیاں ہوتی ہیں تو یہ بات سامنے آجاتی ہے۔

شیر اور ہاتھی کی طاقت کا اندازہ تو ہمیں نہیں ہے مگر ظاہری طور پر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھی شیر سے ڈرتا ہے۔ ہمارا یہ احساس بھی اسپیس سے منسوب ہے۔ حالانکہ ہماری نظروں کو ہاتھی بہت بڑا اور بھاری نظر آتا ہے اور شیر اس کے تقابل میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ آنکھوں کی اسپیس ہے جو تمام چیزیں بتاتی ہے کہ ہاتھی اتنا بڑا ہے اور شیر اتنا چھوٹا ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ شیر، ہاتھی کے مقابلہ میں زیادہ ہمت اور طاقت رکھتا ہے۔ اور اکثر ہاتھی اس کا مقابلہ نہیں کرتا مگر ڈر کر بھاگ جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ تیسری اسپیس یعنی کہ سمجھنے کی اسپیس جو ہمیں بتاتی ہے کہ شیر ہاتھی سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اب وہ خوف جو ہاتھی کے دل میں شیر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے ہماری سوچنے کی اسپیس ہی ہمیں بتاتی ہے۔ اب اگر شیر ہاتھی پر حملہ کر دے تو ہاتھی کی چیخ ہمارے کانوں میں آتی ہے اور یہ آواز ہمارے ذہن میں پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ سمجھنے کی اسپیس ہمیں بتاتی ہے کہ ہاتھی ڈر گیا ہے۔

اعلیٰ اسپیس میں جنت کی اسپیس علیین کی اسپیس اور برزخ کی اسپیس میں شامل ہیں۔ ادنیٰ اسپیس میں محشر کی اسپیس، سجیین کی اسپیس اور ناسوت کی اسپیس شامل ہیں۔ یہ بات پھر سوچنے کے قابل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اسپیس سے علیین کی اسپیس کو چھوڑ کر ناسوت کی اسپیس میں آئے۔ ان کی تمام نسل بھی اسی طرح عالم ناسوت میں آتی ہے۔ سجیین کی اسپیس یا علیین کی اسپیس اس کے بعد آتی ہے۔ جنت کی اسپیس، ناسوت کی اسپیس سے بالکل مختلف ہے۔ جنت کی اسپیس میں آرام، خوشی اور تندرستی ہے۔

ناسوت کی اسپیس میں تکلیف، رنج ہے، بیماری ہے اور مختلف اقسام کی پریشانیاں ہیں جو انسان کے اوپر ہیں۔ یہ بہت تھوڑی مدت ہے۔ انسان کی عمر کم ہوتی ہے، اس لئے اس اسپیس میں جتنی تکلیف اور پریشانیاں ہوتی ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے مگر جس کے اوپر وہ بیتی ہیں اسے ایسا لگتا ہے کہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان اس اسپیس سے گزر جاتا ہے۔ اب اسے اس اسپیس میں جانا پڑتا ہے جو اس نے اپنے لئے تجویز کی ہوتی ہے۔ تجویز کرنے سے مراد خیال میں تجویز کرنا نہیں ہے۔ بلکہ عمل میں تجویز کرنا ہے جو اس کا ضمیر اسے بتاتا ہے کہ انسانی افعال یہ ہیں اور غیر انسانی افعال یہ ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ القمر میں چار جگہ فرمایا ہے:

"ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر"

میں نے قرآن کو سمجھنا آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی سمجھنے والا؟

یہ معمولی سوال ہے اس میں کسی جگہ یہ شرط نہیں کہ مخاطب عربی جانتا ہو یا اس نے عربی پڑھی ہو۔ مگر اس کے معنی بہت ہی سادہ ہیں کہ چاہے وہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ہو، چاہے اس کی مادری زبان کوئی بھی ہو، چاہے اس نے عربی کا ایک لفظ بھی نہ سنا ہو، اللہ تعالیٰ نے قرآن کے معنی ضمیر کے ذریعہ اس کے لئے صاف کر دیئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذہن میں وہ

باتیں ڈال دیتا ہے جو انسانیت کے مطابق ہیں اور یہ اس کا باطن ہے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ قرآن پاک عربی جاننے والوں کے لئے یا صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ اس لئے کہ بہت سارے ایسے مسلمان ملیں گے جو عربی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے مگر جب ان کا دھیان اس ان دیکھی طاقت کی طرف جاتا ہے جس کی وہ پوجا کرتے ہیں یا جسے وہ مانتے ہیں یا جسے وہ خدا کہتے ہیں یا جسے وہ اپنا باطن سمجھتے ہیں یا جسے وہ اپنے ضمیر کی آواز کہتے ہیں۔ دیگر الفاظ میں وہ کبھی سیلف (SELF) کہتے ہیں۔ جس کے سامنے وہ بالکل برہنہ ہیں جس سے وہ خود کو چھپا نہیں سکتے۔ جسے وہ حاضر و ناظر کہتے ہیں اور قدم بقدم اللہ تعالیٰ انہیں ان کے ضمیر کے ذریعہ سمجھاتا ہے کہ یہ افعال انسانی ہیں یا غیر انسانی ہیں۔ اگر انسان وہ آواز نہیں سنتا اور اس کی پرواہ نہیں کرتا تو وہ شخص سجّین میں اپنا گھر بناتا ہے۔ پہلے وہ ادنیٰ میں آیا یعنی عالم ناسوت میں آیا پھر زیادہ ادنیٰ میں گیا یعنی سجّین میں چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ سجّین سے سب راستے سجّین میں ہی کھلتے ہیں، علیین میں کھل نہیں سکتے۔ یہ بات ادنیٰ اسپیس کی تھی۔ ادنیٰ اسپیس کے بارے میں آپ کو تجربہ ہے۔ اس لئے کہ آپ عالم ناسوت میں رہتے ہیں جہاں جو پریشانیاں ہیں جو تکالیف ہیں وہ ظاہر ہیں۔ ہم اس اسپیس سے خوش تو بہت ہوتے ہیں مگر ہماری خوشی ناخوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ناسوت کی غمگیں وسعتیں

فکر اور غم ''انر سیلف'' (INNER SELF) کو ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے اسے بھولنا چاہتے ہیں اور اسی لئے ہنستے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت پر تفکر کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہمارے افعال غیر انسانی ہیں۔ اگر ہمارے افعال انسانی ہوتے تو ہماری موجودہ حالت اس سے مختلف ہوتی۔ ہمیں ان سب باتوں کی چھان بین کرنی چاہئے۔

جس سے اصلیت صاف ہو جائے اور پردے کے پیچھے جو کچھ ہے وہ ہمارے سامنے آجائے۔ اگر ہم اسی طرح بے پرواہ رہیں گے تو نتیجہ اچھا نہیں ملے گا۔

مثال کے طور پر ہماری سوچ کہ دنیا ایسی ہی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ دنیا میں انسان ایسے ہی چلا جاتا ہے۔ آرام اور رنج ساتھ رہتے ہیں، اس کے بغیر ایک دوسرے کا فرق نہیں ہو سکتا۔ ہم اس منطق سے اپنے ضمیر کو سمجھاتے ہیں مگر کیا ہم نافرمانی اور ظلم کر کے اور غیر انسانی افعال کر کے سکون پا سکتے ہیں؟ کیا ہمارے ضمیر کو اس طرح سکون ملے گا؟ ہمارا ضمیر اس منطق سے الجھن میں نہیں پڑ جاتا؟ کیا آپ ضمیر سے پیچھا چھڑانے کے لئے نہیں بھاگتے؟ کیا آپ اس آگ سے اپنا دامن بچانے کی روحانی کوشش نہیں کرتے؟ کیا ضمیر کو جھٹلانے کے بعد بھی انسان وہی رہتا ہے جو پہلے تھا؟ کیا انسانیت میں کچھ فرق نہیں آتا؟ کیا آپ غیر انسانی کاموں کو رنگینیوں کے ذریعہ چھپانے کی کوشش نہیں کرتے؟ رنگینیوں سے مراد زبان پر کچھ ہو اور دل میں کچھ اور ہو۔ اس کے باوجود بھی آپ دوسروں کے ان افعال کا مذاق اڑاتے ہیں جو آپ خود کرتے ہیں کب یہ ٹھیک ہے؟

یہ تو جملہ قابل اعتراض تھا ویسے ہی بات میں بات آگئی۔ اس لئے لکھا گیا اس کا مطلب کسی کے اوپر اعتراض کرنے کا نہیں ہے۔ ادنیٰ اسپیس کی تفصیل ہو رہی تھی کیونکہ ادنیٰ اسپیس ہمارے دماغ کے بارہ کھرب GATES میں موجود ہے۔ مگر اس کا رشتہ اعلیٰ اسپیس کے ساتھ بھی ہے۔ جب ہمیں کچھ معمولی سا وہم ہوتا ہے تو اس کی گہرائی میں دوسرا گیٹ ہے اور پھر تیسرا یعنی خیال اور احساس دونوں GATES اس کی گہرائی میں موجود ہیں اور دوسری گہرائی میں حرکت، عمل اور نتیجہ ہیں۔ یعنی کہ یہ تینوں GATES گہرائی اور اس کی گہرائی میں ہیں۔ آخری گیٹ ''کن'' کی اسپیس سے جا کر ملتا ہے۔ ہم وہم کو صرف وہم سمجھ کر رد کر

دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی گہرائی میں خیال اور احساس کے GATES ہیں اور ہر گیٹ کے بعد گیٹ اس طرح نتیجہ تک پہنچ کر اعلیٰ اسپیس سے جا ملتے ہیں۔

ہم اکثر ایسا کہتے ہیں کہ "چھوڑو یہ وہم ہے۔" مگر اس کی گہرائی میں یقین، بھروسہ بھی ہے جو "کن" کی اعلیٰ اسپیس سے جا کر ملتا ہے۔ اگر ہم اسے بیچ میں چھوڑ دیں تو جس چیز کے بارے میں ہمیں وہم ہوا ہے وہ ادھورا رہ جائے گا یا کچھ گہرائی میں جا کر ہم اس خیال کو رد کر دیں گے جواب تک وہم تھا یا احساس کے درجہ میں رد کر دیں گے یا حرکت یا عمل کے درجہ میں کسی نہ کسی طرح رد کر دیں گے۔ اگر سوچیں تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ ہماری ناکامی کی سرف یہی وجوہات ہیں۔ جب تک ہم کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے وہم اعلیٰ اسپیس سے منسوب نہیں ہوتا۔ اور "کن فیکون" کی بات اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب اس آیت کا کام پورا ہو جائے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے:

انما امره اذا اراده شيئا ان يقوله له كن فيكون

یعنی اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ "اذا اراد اشیئا" جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی ایک چیز کا۔ زیادہ چیزوں کا نہیں۔ کتنی ہی چیزوں کا وہم یا خیال آتا ہے تو سارے GATES اوپن ہو جاتے ہیں۔ جو اشیاء سے منسوب ہیں آپس میں ٹکراتے ہیں، ٹکرانے کے معنی یہ کہ کوئی گیٹ اوپن رہتا ہے اور کوئی کلوز ہو جاتا ہے۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔ یہاں اللہ تعالیٰ خاص کر "امر" کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ارادہ ہونا چاہئے ایک چیز کا نہ کہ بہت ساری چیزوں کا۔ اگر ایک ہی وقت پر ایک چیز خیال میں آئے تو اسے رد کرنے والی اور کوئی چیز نہیں آنی چاہئے۔ یعنی کہ پہلے ہاں کہنا، پھر نہ کہنا یہ اصول ہی غلط ہے۔ یہ دراصل قرآن پاک کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو قانون بنایا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ میری سنت میں تبدیلی اور تعطل نہیں ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ کائنات میں صرف اللہ کی سنت جاری اور قائم ہے۔ اس کی مخالفت کرنے والا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آپ کو ان باتوں سے پتہ چل گیا ہو گا کہ ادنیٰ و اعلیٰ اسپیس میں ایک رشتہ ہے، ایک ربط ہے، ایک وابستگی ہے۔ ادنیٰ اسپیس، اعلیٰ اسپیس کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ ہر ادنیٰ اسپیس، اعلیٰ اسپیس کے ساتھ منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ میرے ہادی اور رہنما آئیں گے۔ اگر آپ ان کے کہنے کے مطابق عمل کریں تو آپ کو آپ کے آباؤ اجداد کا وطن واپس کر دیا جائے گا جو یقیناً جنت ہے۔ اس کی گہرائی میں یہی معنی چھپے ہوئے ہیں کہ ادنیٰ اسپیس، اعلیٰ اسپیس سے منسوب ہے یعنی کہ عالم ناسوت سے جنت میں جانے کا راستہ کوئی بھی ہو، چاہے علیین کا ہو چاہے محشر کا ہو ایک راستہ ہے، ایک رشتہ ہے اور ایک وابستگی ہے۔

عالم ناسوت ادنیٰ اسپیس ہے۔ جنت اعلیٰ اسپیس ہے۔ان دونوں SPACES کی کیفیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام اور جناب حوا نے نافرمانی کی توان کو احساس ہوا کہ وہ برہنہ ہیں۔

ادنیٰ اسپیس کے کچھ درجہ اعلیٰ اسپیس کے زیادہ قریب ہیں۔یعنی حرکت، عمل اور نتیجہ۔ یہ تینوں حالتیں اعلیٰ اسپیس سے مقابلتاً قریب ہیں۔ نیز میرا منشاء یہ ہے کہ وہم، خیال اور احساس اعلیٰ اسپیس سے مقابلتاً دور ہیں۔ آخری تین حالتوں میں امید کی اسپیس پیدا ہو جاتی ہے۔ وہم، خیال اور احساس کی اسپیس عموماً شک کی اسپیس کے زیادہ قریب رہتی ہے۔اس لئے وہم کے ساتھ ہی فوراً نتیجہ پر پہنچ جانا چاہئے۔ جو اعلیٰ اسپیس سے ملا ہوا ہے اور کامیابی کا یقین دلاتا ہے۔مزید یہ کہ تینوں حالتیں یقین کی اسپیس کے قریب ہیں اور یقین کی ہی اسپیس ہے جو اعلیٰ اسپیس سے ملی ہوئی ہے۔

اب ادنیٰ اسپیس کے دو حصے ہو گئے۔ایک حصہ شک اور وہم کی اسپیس کے قریب لاتا ہے اور دوسرا حصہ حق الیقین کے قریب لے جاتا ہے۔اس لئے تصوف میں اس کے تین حصے متعین کئے گئے ہیں۔

حرکت سے انسان علم الیقین کی اسپیس میں داخل ہو جاتا ہے۔ عمل سے انسان عین الیقین کی اسپیس میں پہنچ جاتا ہے اور نتیجہ سے انسان حق الیقین کی اسپیس میں چلا جاتا ہے۔ یہ انسان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔اگر ادنیٰ اسپیس کی ابتداء میں وہ وہم، شک میں پھنس جاتا ہے یا دونوں سے گزر کر احساس کی اسپیس تک پہنچتا ہے تو ادھر رک جانا اس کے لئے غضب ہے۔اس لئے کہ احساس سے منسوب GATES فوراً کلوز ہو جائیں گے اور نتیجتاً اُس کا دھیان کسی اور سمت میں چلا جائے گا۔اور یہ انسان کی بہت بڑی ناکامی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ تفکر کرو، تدبر کرو، مگر جنت میں حضرت آدم علیہ السلام پر جو کچھ بیتی اسے پڑھ کر ہم ذرا بھی سوچتے نہیں ہیں اور پڑھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یا ادم اسکن انت و زوجک الجنته و کلا منها رغداً حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکون من الظالمین o 35/2

اے آدم! آپ اور آپ کی بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ جہاں سے چاہو خوش ہو کر مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

اس آیت میں کچھ باتیں قابل غور ہیں، کھاؤ جہاں سے چاہو مگر اس درخت کے قریب نہیں جانا۔اس میں کچھ نہیں کہ وہ درخت کس چیز کا تھا۔اور کیا تھا مگر حیث شئتما میں اللہ تعالیٰ نے جنت کی اسپیس کی وسعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کھاؤ جہاں سے چاہو، مگر جیسے ہی حضرت آدم علیہ السلام سے نافرمانی سرزد ہوئی اور انہیں برہنہ ہونے کا احساس ہوا۔ میں اس کی تفصیل پہلے بھی کر چکا ہوں

کہ حضرت آدم علیہ السلام میں حس موجود تھی یعنی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اسپیس میں جو حس سوگئی تھی یا جاگ رہی تھی اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ البتہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ نافرمانی کی اسپیس اس حس سے ضرور مغلوب تھی جس نے اس حس کو جگا دیا۔ دوسری بات یہ کہ نافرمانی کی اسپیس اتنی وسیع تھی کہ اس نے ادنیٰ اسپیس پر قابو پالیا یعنی جب آدم علیہ السلام عالم ناسوت میں آگئے پھر بھی نافرمانی کی اسپیس ساتھ رہی جس کا ثبوت آدم علیہ السلام کی نسل دے رہی ہے۔

نافرمانی کی اسپیس کی وسعت کے بارے میں آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عالم ناسوت میں ہر بھلائی کے سامنے ایک برائی موجود ہے۔ اب ہم یہ کرتے ہیں کہ جب بھی کوئی بھلائی ہمارے ذہن میں آتی ہے تو ہمیں اس میں نہ کوئی لذت نظر آتی ہے اور نہ کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ ہمیں ایک اجڑی ہوئی صورت میں نظر آتی ہے۔ نتیجتاً ہم اسے ایک نظر اٹھا کر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اب ہم برائی کی طرف توجہ کرتے ہیں جس میں ہمیں لذت محسوس ہوتی ہے۔ دلچسپیاں لگتی ہیں اور ظاہری فوائد نظر آتے ہیں۔ یہی شئے ہمارے لئے پرکشش بن جاتی ہے۔ یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ نافرمانی کی اسپیس غالب اور بھلائی کی اسپیس مغلوب ہوتی ہے۔ ذرا سوچیئے کہ ہم ایک سیکنڈ کے لئے بھی بھلائی کے پردے میں جو فوائد ہیں ان کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ یہ حقیقت میں نافرمانی کی اسپیس ہے اور برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے معنی ہم یہ کریں گے کہ نافرمانی کی اسپیس ہر قسم کی ادنیٰ اسپیس کے اوپر غالب ہے اور ہر قسم کی ادنیٰ اسپیس سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ بھلائی کی اسپیس چاہے کتنی ہی کم ہو ہمیں اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اگر ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو اس میں چھپے ہوئے فوائد کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ اس بات کی نزاکت کا اندازہ حس کے ذریعہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام اور جناب حوا نے خود کو برہنہ محسوس کیا۔

ہ نافرمانی کی اسپیس کی اول طاقت ہے جو آدم علیہ السلام اور حوا کی ہر حس پر چھاگئی۔ اس لئے کہ اس وقت ان کے ذہن پر برہنہ پن کے علاوہ کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اب یہ احساس کہاں سے آیا؟ کیسے پیدا ہوا؟ میری منشاء یہ ہے کہ ہر اس چیز پر جو نافرمانی کی اسپیس پر وار کر سکتی ہے۔ پردہ پڑ گیا اور انہوں نے نے بالکل لاپروائی کے ساتھ نافرمانی کی اسپیس میں قدم رکھ دیا۔

اب آپ سوچیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ نافرمانی کی اسپیس کتنی خطرناک ہے جو ہمیں کسی بھی بھلائی کی طرف جانے سے روکتی ہے۔ زبردستی سے یا خوشی سے اگر ہم کسی بھلائی کی طرف دیکھنے کے لئے تیار بھی ہو جاتے ہیں تو نافرمانی کی اسپیس ہماری آنکھوں کو کچھ ایسا بتاتی ہے کہ ہم اس منظر سے ڈر جاتے ہیں یا کچھ بڑے سے بڑا نقصان پیدا ہونے کا خدشہ ہو جاتا ہے یا کوئی بڑے سے بڑے اندیشے میں آکر ہمارے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔

اب آپ دیکھتے ہیں کہ نافرمانی کی اسپیس کے چھا جانے سے ہم کتنی بھلائیوں سے دور رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں کچھ خرچ کرنا پڑے تو اس سے روگردانی سکھاتی ہے، کہتی ہے کہ یہ زہد ہے جس سے کچھ فائدہ نہیں، اس لئے یہ نکمی شئے ہے۔ اسی طرح ہمیں

دوسروں کی ہمدردی کرنے سے دور رکھتی ہے۔ جو ہماری ہمدردی کے حقدار ہیں۔ ان سے ہمیں انجانا بناتی ہے۔ حقیقت میں ہم کبھی سوچتے نہیں کہ جن باتوں کو ہم اللہ تعالیٰ کا حکم ہی نہیں مانتے تو ان باتوں کی نافرمانی کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو بڑے بڑے گناہوں کی جڑ بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر حسد، دشمنی کی جڑ ہے جو دوسروں کی بے جا مخالفت کے لئے تیار کرتی ہے۔ مثال کے طور پر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بڑی سے بڑی بات کا عنصر بن جاتا ہے۔ ایسی سب باتیں اس اسپیس کی حرکت کا نتیجہ ہیں جو نافرمانی سے منسوب ہیں۔

جب ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں تو اس کی رحمت سے دور ہو جاتے ہیں اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور نہ ہو جائیں تو وہ ہمیں ان برائیوں سے دور رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کا مجھے اور آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جو نافرمانی کی اسپیس کو کاٹ کر ختم کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہماری حفاظت کر سکتی ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس کے ذریعہ ہم صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ میرا مقصد تقریر کرنے کا نہیں ہے، حق بات کہنے کا ہے۔ ہر ایک فرد اپنے کاموں کی طرف دھیان تو دیتا ہی ہے، اگر تھوڑا سا دھیان اس بات پر دے تو بڑی سے بڑی خوبیاں پا سکتا ہے۔

دماغ

اگر آپ کسی شخص کے دماغ کی کوئی مخصوص رگ میں سوئی چبھوئیں گے تو دماغ کے جس گیٹ کے وہ نزدیک ہو گی وہ گیٹ اوپن ہو جائے گا۔ وہ شخص ہنسنے لگے گا اور ہنستا ہی چلا جائے گا۔ بالکل اسی طرح اگر رونے والے گیٹ میں باریک پن چبھائی جائے تو وہ فرد رونے لگے گا اور جب تک وہ گیٹ اوپن رہے گا اس کا رونا جاری رہے گا۔ کچھ لوگ بلاوجہ ہنستے نظر آتے ہیں۔ ان پر ہنسنے کا موڈ چھایا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ سوچنے کی اسپیس GATES کو حرکت دیتی ہے اور کلوز کرتی ہے۔ یہ حالت صرف زندگی میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسپیس میں کوئی الیکٹران اپنے مرکز سے الگ ہونے کے لئے جمپ لگاتا ہے تو باہر سے کوئی الیکٹران اس جگہ کو پُر کرنے کے لئے آگے آجاتا ہے۔ جب الیکٹران کا یہ فعل باہر کی طرف جمپ لگانا، دوسرے الیکٹران کا اس کی جگہ لینا، اسپیس کے اندر رونے یا ہنسنے والے GATES کو یا سنجیدہ کرنے والے GATES کو یاد یکھنے والے GATES کو یا سونگھنے والے GATES کو حرکت دیتا ہے تو اس حرکت سے جو نتیجہ ملتا ہے اسے ہم بولنا، سونگھنا، ہنسنا، رونا وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جب ہم کسی مرحوم رشتہ دار کو یاد کرتے ہیں تو جس قسم کی حرکت ہوتی ہے یا حرکت ایسی ہوتی ہے کہ وہ سنجیدگی کے GATES کو چھو لیتی ہے اور وہ شخص سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ فعل بار بار ہو تو انسان اداس ہو جاتا ہے اور مسلسل ہونے لگے تو رونے لگتا ہے۔ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ کے کسی دوست کو یکایک کوئی بات یاد آجاتی ہے اور اس بات کا کوئی رشتہ موجودہ ماحول سے نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی نہ کوئی الیکٹران باہر جمپ لگاتا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی الیکٹران اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس تبدیلی سے میری مراد الیکٹران نہیں مگر وہ BEHAVIOUR ہے جسے الیکٹران کہتے ہیں۔ وہ BEHAVIOUR جن GATES کو چھو لیتا ہے وہ GATES اوپن ہو جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تحریریں بھی یاد آجاتی ہیں۔ اس شخص کو تعجب ہوتا ہے کہ نہ تو ایسی کوئی بات ہو رہی تھی اور نہ ماحول میں ایسا کچھ ہوا ہے جس کا اس سے رشتہ ہو، اگر یہ سمجھنا مشکل ہے تو کیا وجہ ہے۔

آپ نے کسی ڈاکو کے بارے میں یہ پڑھا ہو گا کہ اس نے کسی شخص کو بھاری چیز سے سر پر چوٹ ماری اور جس شخص کو سر پر چوٹ لگی وہ بے ہوش ہو گیا۔ بے ہوش ہونے کی وجہ بالکل سیدھی سادی ہے۔ کھوپڑی کی ہڈی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ بدن میں ایسی مضبوط ہڈی شاید ہی کوئی ہو۔ چوٹ کا اثر ہڈی پر نہیں مگر دماغ کے اندر جو برقی رو ہے اس پر ہوتا ہے جس سے اس کے اندر خلل واقع ہو جاتا

ہے اور GATES اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں یا جب تک چوٹ کا اثر رہتا ہے وہ شخص بے ہوش رہتا ہے۔ایسے موقع پر سر پر مالش کی جائے تو وہ شخص جلد بیدار ہو جائے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ برقی رو دماغ کو ماحول کے ساتھ ملاتی ہے جو ہاتھ کے ذریعے بہت جلد ہوتا ہے اور تمام زخمی GATES کو آرام ملتا ہے۔آرام ملنے سے وہ شخص ہوش میں آجاتا ہے۔اسپیس میں ہر پل یعنی کہ سیکنڈ کے چھوٹے سے چھوٹے حصے میں بھی کچھ تبدیلی ہوتی ہے۔

اس کے بارے میں ایک صوفی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ جس دریا کو میں نے زندگی میں ایک مرتبہ پار کیا ہے اس دریا کو زندگی میں پھر کبھی پار نہیں کیا۔حالانکہ وہ ایک دریا کے کنارے رہتا تھا اور دن میں کئی مرتبہ اسے پار کرتا تھا۔وہ حقیقت میں اس بات کو کچھ حد تک ضرور سمجھتا تھا کہ سیکنڈ کے ہر حصے میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور واقع ہوتی ہے۔انسان کی نظر اس تبدیلی کو سوچنے اور سمجھنے سے قاصر ہے۔کوئی درخت جو آپ کے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے سے ہر پل بڑھتا ہے یا کم ہوتا ہے۔اندر بھی اور باہر بھی۔

کونپلوں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ بڑھتا ہے مگر یہ کیسے بڑھتا ہے اس کے بارے میں ہم سوچتے نہیں ہیں۔حقیقت میں اس کے بڑھنے کی وجہ اسپیس ہے،اسپیس میں تبدیلی ہے۔اسپیس اپنی کاریگری ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے اور ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ درخت میں کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک پتہ بالکل ہرا ہے اور کچھ وقت کے بعد وہ سوکھ جاتا ہے اور اپنی جگہ سے گر جاتا ہے۔یہ عمل ہر پل ہوتا رہتا ہے یعنی کہ کونپل سے پتہ بنتا ہے اور پتہ سوکھ جاتا ہے۔یہ تمام عوامل اسپیس کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

اسپیس کا اپنا عکس ہر چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے اور ہر سیکنڈ کے چھوٹے سے چھوٹے حصہ میں بھی یہ تبدیلی عمل میں آتی رہتی ہے۔دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ عمل یکطرفہ نہیں ہوتا مگر ہماری آنکھوں میں بھی ہوتا ہے۔ہمارے دماغ میں بھی ہوتا ہے اور ہماری پوری زندگی کے درمیان یہی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں یعنی عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔ایک طرف شاہد میں اور دوسری طرف مشہود میں۔یکطرفہ کبھی نہیں ہوتا۔ہم جب کوڑے کے ڈھیر میں آگ لگاتے ہیں تو وہ جلنے لگتا ہے اور اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔کوڑے کو آگ سے کیا رشتہ؟اسی کوڑے سے آگ نکلتی ہے جہاں ایک سیکنڈ پہلے آگ کا نشان موجود نہیں تھا۔وہ ایک الگ بات ہے کہ کوڑا آخر میں راکھ بن جاتا ہے۔مگر یہ بات سمجھنے کی ہے کہ لال شعلے جو کوڑے میں سے نکلے تھے وہ کہاں سے آئے اور کہاں گئے؟حالانکہ کوڑے سے لال شعلوں کا اور جلنے کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

جس چنگاری سے آگ کی ابتداء ہوئی وہ تو صرف ایک چنگاری ہی تھی۔اس کی حیثیت چنگاری سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔مگر دیکھنے والی آنکھ اسے بڑھتی ہوئی آگ کی شکل میں دیکھتی ہے اور شعلوں پر شعلوں کا احساس ہوتا ہے۔کبھی کبھار آبادیاں،بستیاں بھی جل جاتی ہیں اور ہمیں راکھ کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔حقیقت میں یہ تمام شعلے اسپیس سے آئے تھے اور اسپیس میں گم ہو گئے۔ہم

کسی چیز کے ڈائی مینشن اسپیس میں دیکھتے ہیں یعنی کہ لمبائی، چوڑائی اور موٹائی اور کبھی یہ سوچنے کی تکلیف نہیں کرتے کہ یہ سب کیسے نظر آتا ہے؟ آپ ذرا تھری ڈائی مینشن فلم کے اوپر سوچیں۔ اس فلم میں کچھ گہرائی نہیں مگر آپ کی آنکھوں پر جو چشمے لگے ہوئے ہیں اس میں گہرائی موجود ہے جو آپ کو نظر آتی ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک دیوار کی لمبائی، موٹائی اور چوڑائی سب آپ کے سامنے موجود ہیں۔ اگر ہم اس فلم سے گہرائی نکال لیں تو صرف تصویر رہ جاتی ہے اور تصویر کو مائیکرو فلم میں تبدیل کر دیں تو صرف ایک ذرہ رہ جائے گا۔ اور ذرہ کے ٹکڑے کر دیں تو ذرہ کے ہر ٹکڑے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہوں گی مگر ٹکڑے ہونے سے اور چھوٹا ہونے سے ایک وقت ایسا آئے گا کہ ٹکڑے کا ہر حصہ آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا، تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ذرہ کی ہستی مٹ گئی؟ ہر گز نہیں۔ میں یہ بات کسی طرح بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ ذرہ موجود نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذرہ میرا دیکھا ہوا ہے اور میرے ذہن کے پردے پر موجود ہے۔ حالانکہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا مگر ہم اس کی ہستی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس چیز کے اوپر اگر آپ اپنا ذہن مرکوز کریں تو اسپیس یا ایتھر کا خیال فوراً آئے گا اور یہ بات آپ کے ذہن میں آ جائے گی کہ کوئی چیز اسپیس کی حرکت میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتی اور اس میں لچک یہ بھی ہے کہ ہر مائیکرو فلم یا تو کم ہو گی یا بڑھے گی۔ ایک ہی حالت میں قائم نہیں رہتی۔ یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات میں تمام جاندار، نباتات، جمادات وغیرہ کی نسلیں چلتی ہیں۔

ایک چھوٹی سی مثال یہ بھی ہے کہ جس سے یہ بات ذرہ زیادہ واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ کونپلیں بڑھ کر پتے کی شکل اختیار کرتی ہیں تو ان کے اندر ایٹموں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے مگر اللہ کی سنت کے مطابق جب وہ چیز اپنی انتہا کو پہنچتی ہے تو ایٹموں کی تعداد کم ہونا شروع ہو جاتی ہے، پتوں کا رنگ بدلتا جاتا ہے اور یہ افعال سلسلہ وار ہوتے ہیں۔ پتہ کا رنگ ہی نہیں بدلتا مگر وہ سکڑتا بھی ہے۔ یہاں تک کہ سوکھ جاتا ہے اور درخت کی ڈالی پر لگا ہوا نہیں رہ سکتا، مگر الگ ہو کر گر جاتا ہے اور کمزور اور چھوٹا ہوتے ہوتے مائیکرو فلم بن جاتا ہے اور وہ پھر وہی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اسے جلایا جائے۔ اگر جلایا نہیں بھی جائے، پھر بھی وہ ایک مائیکرو فلم بن جائے گا اور مائیکرو فلم سے وہی شکلیں اختیار کرے گا۔ کونپل اور کونپل سے پتہ۔ یہ بات انسان کی نظر کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ پتوں کی زندگی کے مرحلے دیکھ سکے یا انہیں گن سکے۔ اس لئے کہ یہ سب افعال انسان سے بات چیت کرنے کے قابل نہیں ہیں، کیونکہ وہ ان کی نظروں سے بالکل چھپے رہتے ہیں۔ وہ صرف ان حالات کو دیکھتا ہے جسے آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، جن کی حدیں کچھ طول موج تک محدود ہیں۔ اگر اس طول موج میں ایک بال بھر کی بھی کمی رہ جائے یا ایک بال بھر کی بھی زیادتی ہو جائے تو آنکھیں اس اسپیس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ اس لیے کہ آنکھوں کی اسپیس اس اسپیس سے اتنی دور ہو جاتی ہے کہ آنکھوں کی اسپیس اس کی نفی کر دیتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہر گز نہیں ہوئے کہ ذرہ فنا ہو گیا ہے۔

اسپیس کی تخلیق

اللہ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

اللّٰہ نور السموات والارض

جب لفظ ارض آیا تو یہ کہنا کہ مٹی سڑی ہوئی ہے یا سڑی ہوئی تھی اس کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ میں اس بات پر بحث نہیں کروں گا کہ مٹی کیسی تھی مگر ایسی تھی کہ جیسی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اب اس آیت پر زور دے کر میں آپ کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسپیس کی تین اقسام ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور ارضی کہا ہے۔ دوسری قسم کہ جب نور ارضی کو روشنی کے طور پر دیکھا جائے اور یہ نور جسے میں نے روشنی کہا ہے، ایک برقی جسم ہوتا ہے جو انسان کے چاروں طرف غلاف کی طرح قائم ہوتا ہے۔ یہ غلاف تقریباً ایک فٹ موٹا ہوتا ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے روح کہا ہے۔ اسے ہم دیکھ نہیں سکتے اور چھو بھی نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ یہ روشنی نہ شرقی (مشرق کی) ہے نہ غربی (مغرب کی) اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسپیس کی ڈائی مینشن میں کوئی سمت نہیں ہے۔ اب اگر ہم کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو برقی جسم کے ذریعہ ہی دیکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ برقی جسم ہماری نظر اور چیز کے بیچ میں رکاوٹ ہے۔

اب ہماری نظر ایک طرف روح کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری طرف برقی جسم کی نمائندگی کرتی ہے اور تیسری طرف اس چیز کی نمائندگی کرتی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسپیس کے ڈائی مینشنز میں تین چیزیں شامل ہیں۔ روح، برقی جسم اور وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ نے ارض کہا ہے۔ ارض کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔ بڑی بھی ہو سکتی ہے، چھوٹی بھی ہو سکتی ہے، ارض درخت بھی ہو سکتی ہے، ارض کوئی فرد بھی ہو سکتا ہے، ارض زمین بھی ہو سکتی ہے، ہم ارض کو چھوتے بھی ہیں، دیکھتے بھی ہیں، سونگھتے بھی ہیں، سنتے بھی ہیں اور چکھتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ ہماری سمجھ کے مطابق یہ ارض کبھی ہمارے سامنے پھول کی شکل میں آتی ہے، کبھی تتلی کی شکل میں، کبھی پھل کی شکل میں۔

اب سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ برقی رو جو ہمارے چاروں طرف غلاف کا کام کرتی ہے، وہی نظر کے لئے منشور (PRISM) بن جاتی ہے اور ہم سے وہ حقیقت چھپا لیتی ہے جو ہمارے اوپر ظاہر ہونی چاہئے۔ اس ہی لئے کہ اللہ تعالی نے ہمیں صاف صاف بتا دیا ہے کہ میرے ہادی آپ کے پاس آئیں گے اگر آپ ان کی بات مانیں گے، ان کے کہنے کے مطابق عمل کریں گے، ان کا اتباع کریں گے تو آپ کو آپ کے آباؤ اجداد کا وطن واپس مل جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اعلیٰ اسپیس اور ادنی اسپیس میں آنے پر نافرمانی نے ہمیں غلط خیالوں میں اور جھوٹے دکھاؤں میں ڈال دیا ہے اور ہم ہمیشہ کے لئے اس میں پھنس گئے ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ پرزم نے ہمیں غلط دکھانا شروع کر دیا۔

جو ہادی ہمارے پاس آئے وہ صحیح طور پر پیغام نہیں پہنچا سکے۔ اس لئے کہ ہم ان کے پیغام کو برابر نہیں سمجھ سکے۔ حقیقت میں یہ خرابی پرزم کی اسپیس نے پیدا کی۔ نتیجہ کے طور پر روح ہماری آنکھوں سے چھپ گئی اور طرح طرح کے بت جو ہمارے خیالات میں نصب ہوئے تھے، ہماری آنکھوں کے سامنے آنے لگے۔ حقیقت میں یہ پرزم کا اثر تھا جو ہمارے جسم پر برقی غلاف کی شکل میں چڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے سامنے آنے کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہمارے دماغ کے اوپر قبضہ کر لیا۔ پہلے تو ہم نے ان بتوں کو توہم، شک میں دیکھا پھر پرزم نے ایسی حرکت کی کہ وہ سب توہمات ہمارے سامنے صورت بن کر آ گئے۔ اور جتنے جتنے وہ ہمارے قریب آتے گئے اتنے اتنے ہم حقیقت سے دور نکلتے گئے۔

پرزم کی وجہ سے ہم کسی چیز کو چھوٹی سے بڑی ہوتی ہوئی دیکھتے ہیں۔ کسی چیز کو ختم ہوتے دیکھتے ہیں۔ کوئی چیز ہمارے وہم میں ہو اسے آہستہ آہستہ صورت میں دیکھتے ہیں۔ ہم اس چیز کو اپنی کوششوں کا نتیجہ سمجھنے میں فرق نہیں کرتے۔ میں آپ کو اس کی مثالیں دے رہا ہوں مثلاً جس نے ٹیلیفون ایجاد کیا وہ چاہے ایک فرد ہو یا زیادہ اس نے آہستہ آہستہ ترقی کی اور اپنے خیالات کو عملی شکل دی۔ نتیجہ کے طور پر موجودہ جو ٹیلیفون ہے اس کی شکل ہمارے سامنے آ گئی یہ وہی پرزم کا اثر تھا جس نے ہمارے امیج یا عکس کو مختلف تجربوں اور مراحل پار کرواکے ٹیلی فون بنا دیا۔ یہی معاملہ ٹیلی ویژن کا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ مگر اس سمت میں کوششیں کیں تو آہستہ آہستہ یہی پرزم، ٹیلی ویژن کو ایک شکل میں ہمارے سامنے لے آیا۔ یہ بات الگ ہے کہ کتنے مرحلہ پار کرنے پڑے اس میں مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ انسان کے ذہن کی ایجاد ہے۔ یہی مثال ہوائی جہاز کے سلسلہ میں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہی بات ایٹم کے بارے میں ہے کہ وہ پرزم کے ذریعہ اصل شکل میں ہمارے سامنے آ گیا۔ ہمارے سامنے ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں۔

تاریخ اس پرزم کی ہی وجہ سے بدلتی رہتی ہے۔ اگر آپ پرزم کی زیادہ تفصیل چاہیں تو وہ بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف پرزم ہمیں ہمارا جسم بتاتا ہے، ہماری ہڈیوں کو سخت بتاتا ہے، ہمارے گوشت میں ایک خاص قسم کی لچک بتاتا ہے۔ دوسری طرف یہی پرزم

ہمیں بتاتا ہے کہ ہر چیز مٹی ہے اور مٹی سے مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ خیال کو کچھ اہمیت نہیں دیتا اور دوسری طرف وہ خیال سے دس سال، بیس سال، تیس سال، ہزار سال کی شکل بنالیتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا تاریخ، جغرافیہ وغیرہ سب علم کی شاخیں ہیں۔ یہ میں نے قرآن کی رو سے لکھا ہے میں اپنی طرف سے نہ کوئی بات لکھ سکتا ہوں، نہ لکھنا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے آدم کو علم الاسماء سکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو زمین دی یا درخت دیئے یا پہاڑ دیئے یا دریا دیئے۔ نہ تو اللہ تعالیٰ نے یہ تفصیل کی ہے کہ میں نے آدم علیہ السلام کو کپڑے پہنائے۔ صرف یہی فرمایا ہے کہ میں نے آدم کا پتلا مٹی سے بنایا اور اس میں، میں نے روح پھونکی اور آدم کو علم الاسماء سکھایا۔

دوسری جگہ سورۃ یاسین کی آخری آیت میں ارشاد فرماتے ہیں:

انما امرہ اذا ارادا شیئا ان یقول لہ کن فیکونo

اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ارادہ سے کس طرح بدل جاتی ہے، آخر کوئی تو طریقہ ایسا ضرور ہوگا جو اللہ کے سامنے ہے، اللہ کی نظر میں ہے مگر ہمارے سامنے نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمایا کہ تفکر کرو، تدبّر کرو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے ارادے کو علم الاسماء سے ملانا (جوڑنا) ہے، یہ سب پرزم کی بدولت ہوتا ہے جو ہمارے اوپر غلاف (خول) کی طرح ڈھکا ہوا ہے۔ اس کے واضح معنی یہ ہوئے کہ ہماری روح کے اوپر یہ پرزم خول کی شکل رکھتا ہے۔ ہم اسی پرزم کے ذریعہ دیکھتے ہیں، اسی کے ذریعہ چھوتے ہیں، اسی کے ذریعہ جانتے ہیں اور اسی پرزم کے ذریعہ حرکت کر سکتے ہیں۔ یہاں ایک اور آیت بھی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

"آپ سب اتر جائیں۔"

اس کے معنی (مفسرین) تفسیر کرنے والے یہ کرتے ہیں کہ زمین پر اتر جاؤ۔ مجھے اس ترجمہ سے کوئی اختلاف نہیں مگر میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ آپ سب کے سب اس پرزم میں اتر جائیں۔ یہاں کسی جگہ پر بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ ارض استعمال نہیں کیا ہے یعنی کہ اللہ کی نگاہ کے سامنے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں چیزیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ادنیٰ میں اتر جانے کا حکم دیا جو اعلیٰ کے اثرات سے بالکل مختلف تھا۔

زمین سے جتنے بھی انسان خلاء میں گئے چاہے وہ کتنی بھی اونچائی پر گئے ہوں، پریشر سوٹ کے بغیر نہیں جا سکے۔ یعنی کہ پرزم ان پر مسلط تھا۔ اگر وہ آکسیجن نہ ہونے کا بہانہ کریں تو اس پر مجھے کچھ بحث نہیں کرنا ہے۔ وہ اگر چاہیں تو آکسیجن اپنے ساتھ لے جائیں۔

میں ایک ہی بات کہنا چاہتا ہوں کہ وہ پرزم میں ہی تھے، پرزم سے باہر نکل نہیں سکے۔ مگر یہ بات بھی واضح ہے کہ جو خلاء باز کھو گئے وہ اس پرزم کے باہر نکل گئے تھے اور نتیجہ میں ان کی ہستی مٹ گئی یا پھر وہ ایسی جگہ چلے گئے جس کا نام ہم نہیں جانتے۔

خلا بازوں کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہمارے سامنے ہے، اس کے ساتھ ساتھ اور مثال یہ ہے کہ امریکا اور روس نے ایسے سٹیلائٹ خلا میں رکھے ہیں جو اس پرزم کے اندر ہیں اور ساتھ ساتھ ٹیلیفون کا کام بھی کرتے ہیں اور ہم کہہ نہیں سکتے کہ کتنے سارے کام کرتے ہیں۔ مگر ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب پرزم کے اندر ہیں۔ اگر پرزم کے باہر نکل جائیں تو ان کی ہستی نہیں ملتی۔ کسی بھی طرح جو کچھ بھی اس پرزم کے اندر ہے قدرت نے اس پر کچھ حدیں لگا دی ہیں وہ حدیں توڑی نہیں جاسکتیں اور نہ ان سے باہر نکلا جاسکتا ہے۔ مصنوعی سیارے انہیں حدود کے اندر ہی ٹوٹتے ہیں اور ٹوٹ کر گرتے ہیں۔ ان کی نشانیاں بھی مل جاتی ہیں۔ پرزم کے اندر حالات پیدا کئے جاسکتے ہیں جو اہرام مصر میں واضح ہیں۔ مثال کے طور پر ہزاروں سال پہلے کی ممی (MUMMY) آج بھی اسی حالت میں موجود نظر آتی ہے حالانکہ وہاں ہوائیں پہنچتی ہیں جو کسی بھی چیز کو خراب اور ختم کر سکتی ہیں۔ ایسا اکثر ہم روزانہ دیکھتے رہتے ہیں کہ ایک بچہ ایک سال کا ہے پھر وہ دس سال کا ہوتا ہے۔ پھر وہ پچاس سال کا ہوتا ہے اور پھر وہ اسی سال کا ہوتا ہے، پھر اسے موت آجاتی ہے یا سو سال سے بھی زیادہ زندہ رہتا ہے۔ اور ایک بچہ ہے جو ایک سال بھی پورا زندہ نہیں رہتا۔ دونوں اسی پرزم کے اندر ہیں۔ اس کے صاف معنی تغیرات ہیں۔ پرزم کے اندر ہر وقت ہر سیکنڈ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر آپ ان تبدیلیوں پر غور و فکر کریں تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے یہ زمین کیا تھی، لاکھوں سال پہلے کیا تھی؟ اربوں سال پہلے کیا تھی؟

جغرافیہ کے ماہرین اس بات کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں مگر ہزاروں میں شاید ہی دو چار ایک سوچ پر ہم خیال ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ ان کے خیالات ہیں اور ان کے خیالات کو یہی پرزم عملی جامہ پہنا کر ہزاروں کو لاکھوں میں، لاکھوں کو کروڑوں میں، کروڑوں کو اربوں میں تقسیم کرتا ہے۔ وہ صحیح طور پر نہیں بتا سکتے کہ ہمالیہ پہاڑ کی عمر کیا ہے اور بحر الکاہل کس زمانے سے قائم ہے اور یہ براعظم ہیں وہ آج سے کتنے سال پہلے الگ ہوئے۔ یہ سب پرزم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

تفصیل اس بات کی تھی کہ یہ پرزم کائنات کو کم از کم دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو ہمارے نزدیک سے نزدیک حصہ ہے اسے کہتا ہے کہ یہ سب مٹی ہے اور جو ہم سے دور ہے اسے ہماری آنکھیں روشنی یا چمکتی شکل میں دیکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا ہے:

"آپ پہاڑ کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ قائم ہے (حالانکہ وہ قائم نہیں)۔"

یہ بھی پرزم کی تفصیل ہے۔ اسی پرزم کے ذریعہ مستقبل میں ایسی ایسی ایجادیں ہوں گی جو انسانوں کو تعجب میں ڈالیں گی۔ انسان کی ترقی کا راز اسی پرزم میں ہے۔ اب پرزم میں جو حصہ ہمارے نزدیک ہے اس کے بارے میں قرآن پاک میں جگہ جگہ تفصیل ہے:

''اس نے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر بنادیئے۔ کیا تمہیں خدا کی تخلیق میں کوئی کسر نظر آتی ہے۔ پھر نظر پھراؤ کچھ کمی دکھتی ہے۔ تمہاری نظر ردہو کر تھک کر واپس آئے گی۔''

اللہ تعالیٰ نے پرزم ہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

الذی خلق سبح سموت طباقا ماتری فی خلق الرحمن من تفوت فارجع البصر ھل تری من فطورہ ثمہ ارجع البصر کرستین یقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیرہ 3,4/67

''میں نے ایک دوسرے پر سات آسمان پیدا کئے ہیں۔ کیا تجھے اس بناوٹ میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔''

دنیا ابھی تک اس بارے میں حیران ہے۔ آسمان نظر کی حد کو کہتے ہیں۔ نظر کی حد سے مراد کوئی نہ کوئی چیز ہے۔ جہاں نظر رک جاتی ہے۔ پھر وہ چاہے کچھ بھی ہو، نظر بندی ہو، رکاوٹ ہے۔ آپ آسمان کی کیفیت شام کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور کچھ رات گزر جانے کے بعد بھی اور آدھی رات نکل جانے کے بعد بھی اور صبح کے وقت اور دن چڑھا ہو اس وقت بھی اور دوپہر کو دماغ پر مختلف اقسام کی کیفیتیں چھا جاتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کیفیت ہر پل بدلتی رہتی ہے۔ چاہے ایک منٹ ہو چاہے ایک سیکنڈ۔

پھر آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آسمان کو دیکھنے سے یہ پل پل کی تبدیلیاں اور منٹ منٹ کا پلٹنا، موسموں کا بدلتے رہنا ہے۔ مگر اثر میں اس کے مطابق تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسی کہ آسمان کو دیکھنے سے ہوتی ہے۔ اگر آپ غور و فکر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ آسمان کی طرف دیکھنے سے جو آپ پر اثر ہوتا ہے وہ زمین کے اثر پر حاوی رہتا ہے۔ اس کی کچھ وجوہات ہیں۔ زمین کا اپنے محور پر گھومنا اور سورج کے اطراف انڈے کی شکل میں گھومنا دونوں حرکتیں کائناتی یعنی آسمانی حرکتوں سے مقابلتاً کم ہیں۔ یہ حرکتیں پرزم کے اوپر اثر کرتی ہیں۔ جس پرزم کا ہماری آنکھیں استعمال کرتی ہیں اور جس پرزم کو دماغ آنکھوں کے ذریعے دیکھتا ہے۔ یہ وہی پرزم ہے جس کے ذریعہ ہم خود کو چلتے پھرتے اور سانس لیتے محسوس کرتے ہیں۔

جب ہم پیدا ہوتے ہیں تو پرزم کے ذریعہ ہم بولنا، دیکھنا، چکھنا، سونگھنا آہستہ آہستہ سب سیکھتے ہیں۔ اور چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ڈھلان کی طرف آتے ہیں اور جو طاقتیں ہم پرزم سے حاصل کرتے ہیں آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور جو برقی رو ہمارے جسم پر

لگی ہوتی ہے وہ ہمیں چھوڑ دیتی ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ پرزم نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ پرزم ہمیشہ ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ ہم زندہ رہیں تو ہمیں زندگی دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر والی آیت میں فرمایا ہے۔

"کیا رحمٰن کی تخلیق میں تم کچھ فرق دیکھتے ہو۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اپنی طاقتیں اور اختیارات کس کس طرح استعمال کرتے ہیں یہ معمولی بات ہے۔ کچھ سالوں پہلے اس دنیا میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جو اب ہیں۔ آج سے پچیس سو سال پہلے یونان کے ایک باشندے کے دماغ میں ایٹم کا خیال آیا۔ وہ خیال کچھ لوگوں کے ذہن میں پھیلتا گیا۔ نتیجہ کے طور پر بہت ساری چیزیں ایجاد ہوئیں اور پتا نہیں اور کتنی چیزیں ایجاد ہوں گی۔ پرزم کے خواص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جب کوئی فرد اپنے ظاہر سے کام لینا چاہے، لے سکتا ہے اور جب اپنے باطن سے کام لینا چاہے جتنا چاہے لے سکتا ہے۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ انسان کو ظاہر سے زیادہ دلچسپی ہے اور باطن سے کم ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنے دماغ سے کام لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ یہ وہی طاقتیں ہیں جو کبھی تصور تھیں پھر صورت اختیار کر کے سامنے آگئیں۔ ہم باطن سے بھی اسی طرح کام لے سکتے ہیں۔ جیسے کہ ایک خیال پچاس سال میں نتیجہ کی صورت میں آجاتا ہے۔ اگر اس میں ظاہری اسباب شامل ہوں تو ہم اس کو سائنس کہتے ہیں اور اگر ظاہری اسباب شامل نہ ہوں تو ہم اسے کرامت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہی بات کہی ہے:

"کیا تم اپنے رب کی تخلیق میں کچھ فرق دیکھتے ہو؟"

فرق کے معنی ظاہر اور باطن کا فرق ہے۔ اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے:

"میں نے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر بنائے۔"

اب آپ پوری آیت پر تفکر کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ معنی میں اس آیت کے دو حصے نہیں کئے جا سکتے۔ پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ میں نے آسمان کو ایک دوسرے کے اوپر بنایا ہے اور تم کیا میری تخلیق میں کچھ فرق دیکھتے ہو۔ اگر ہمارے سامنے وہ پرزم ہو تو ہم اس آیت کو مکمل طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

"پھر نظر دوڑاؤ کیا تمہیں کوئی شگاف نظر آتا ہے۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر شگاف ہو تو نظر آر پار ہو جائے۔ اب نظر واپس ہو جاتی ہے اس لئے کہ شگاف نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"پھر نظر کر دوبارہ نظر کر تیری نظر رد ہو کر واپس تیرے پاس آجائے گی۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ سب کیفیات جو ایک دوسرے کے اوپر آسمانوں میں ہیں نظر اپنے ساتھ لائے گی۔اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ نظر ہماری نہیں ہے مگر وہ پرزم کا عکس ہے جس کی تفویض اللہ تعالیٰ نے کی ہے۔

آگے پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"میں نے زمین کے آسمان کو تاروں کے چراغوں سے زینت دی ہے۔"

یہ چراغوں والا آسمان ایک الگ کیفیت رکھتا ہے۔آپ جب رات کے وقت چمکتے تارے دیکھیں گے تو آپ کو اس کا اندازہ ہو گا۔

سورۃ واقعہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فلا اقسم بموقع النجومoوانه لقسمه لو تعلمون عظيمه

56/75,76

"قسم کھاتا ہوں میں تارے کے ڈوبنے کی اور یہ قسم تم سمجھو تو بہت بڑی ہے۔"

اس آیت میں بھی اللہ پرزم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔پہلے تو ایک معمولی بات ہوئی ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کی پھر فوراً فرماتا ہے:

"اگر سمجھو تو یہ قسم بہت بڑی ہے۔"

اس کے معنی یہ ہوئے کہ پرزم آپ کو جو کچھ بتاتا ہے وہ عکس بن کر دکھتا ہے۔اس کی تفصیل پہلے آیت میں آچکی ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"میں نے آسمان اول کو تاروں سے زینت دی ہے"

تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہم تاروں کو دیکھتے ہیں تو وہ ان کیفیتوں کو واپس کر دیتا ہے جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں اور جن کیفیتوں کو ہماری آنکھیں قبول کر لیتی ہیں اور اس ہی کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اگر سمجھو تو یہ قسم بہت بڑی ہے۔"

منشاء یہ ہے کہ اس پرزم کی کائناتی حرکت سے ہر چیز ہماری آنکھوں پر رکاوٹ ڈالتی ہے۔ کیا چیز ہے جو رکاوٹ ڈالتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وہ کیفیت، خواص پرزم کے اندر رکھ دیئے ہیں۔ جو ہماری آنکھوں کو نظر آتے ہیں اور رد کر دیتے ہیں یہ کیفیت بار بار ہماری آنکھوں کے سامنے آتی ہے اور بار بار رد ہو جاتی ہے۔ زمین کی سب کیفیات جو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں، ان ہی کیفیات کا حصہ ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر سمجھو تو یہ قسم بہت بڑی ہے۔ یعنی اس کی اہمیت اتنی ہے کہ زمین پر دیکھتا ہے جو اللہ دکھانا چاہتا ہے۔ وہ سب اسی پرزم کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پرزم کے ذریعہ بہت ساری نعمتیں عطا کرتا ہے۔ اسی کی تفصیل سورۃ الرحمٰن میں بار بار آئی ہے وہ سب چیزیں جو ہم زمین پر دیکھتے ہیں، سونگھتے ہیں، چکھتے ہیں، سوچتے ہیں یہ سب اسی پرزم سے واپس ہو کر آتی ہیں۔

سورۃ یاسین کی آیت نمبر ۱۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

و کل شئی احصینه فی امام مبینo 12/36

"ہر چیز کو گن لیا ہے ایک کھلی اصل میں۔"

یہ پرزم کی ہی تفصیل ہے۔ کھلی اصل کی منشاء یہ ہے کہ اس پرزم کے اطراف میں ایک بیلٹ ہے جو گھوما کرتی ہے۔ ایک طرف کائنات کی حرکت کا اس پر اثر ہے۔ دوسری طرف زمین کے محور کی حرکت اور تیسری طرف طولانی حرکت ان تینوں حرکتوں سے مل کر ہماری نظر اور ہماری نظر کے ساتھ جو کچھ ہے وہ ہوتا رہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا "کن فیکون" ہر پل جاری ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جو اگاتا ہے زمین میں۔"

اور آپ کو اس میں اور ان چیزوں میں جن کی آپ کو خبر نہیں ہے۔ اب بہت سارے ایسے علوم ہیں جو انسان کے ذہن میں موجود ہیں مگر ان کو عمل میں آنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ انسان کے دماغ میں آتے ہیں۔ پہلے خیال میں اور پھر کچھ وقت میں چاہے وہ وقت کم ہو یا زیادہ، وہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

"اور میں یہ بات ان کو دکھاتا ہوں۔ رات کو دن سے نکالا گیا۔"

وہ بات جو یہ نہیں سمجھتے وہ پرزم ہے جس کے ذریعہ ہم ایسا کہہ سکتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ اندھیرے میں رہتے ہیں۔ انہیں کچھ علم نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس چیز کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سورج بھی چلتا ہے اسی راستہ پر جو اس کے معین ہے، یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ راستہ زبردست خبر والے کا معین کیا ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ پرزم کا سورج کی رفتار سے بھی رشتہ ہے۔ زبردست اس لئے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار کرشمے سورج سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کرشموں سے واقف ہے جو سورج سے ظاہر ہوتے ہیں اور ظاہر ہوں گے۔

یعنی کہ آپ کے دماغ کے اوپر اور آپ کی زندگی کے اوپر سورج اثرانداز ہوتا ہے۔ میرا اور آپ کا سوچنا۔ میرا اور آپ کا دیکھنا۔ میرا اور آپ کا سننا اور چکھنا، سونگھنا، ہماری ہر ایک حس سورج سے اثر لیتی ہے مگر ظاہر میں اس کا علم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہی پرزم ہے۔

اللہ تعالیٰ آگے فرماتا ہے:

والقمر قدر نه منازل حتى عاد كالعرجون القديم 39/36

''میں نے چاند کی منزلیں متعین کی ہیں۔ جس کا علم آپ کو نہیں ہے۔ یہ ایک پرانی شاخ ہے۔''

کس چیز کی شاخ ہے، اسی پرزم کی جس کا بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس کی سب حرکتوں، رفتاروں کا جاننے والا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں نے ہر چیز کی بیلٹ معین کی ہے۔ نہ چاند، سورج کو پکڑ سکتا ہے اور نہ سورج چاند کو۔ اور یہ ممکن نہیں کہ رات، دن سے آگے نکل جائے اور دن، رات سے آگے نکل جائے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے کیا انتظام کیا ہے، کس لئے کیا ہے، اس کے اثرات کیا ہیں، ان سب باتوں کا اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو پرزم میں پہلے سے ہی موجود رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں نے ان کو اس طرح بنادیا ہے جس طرح وہ لوگ چلتے ہیں۔ مگر ایک معین راستے پر ایک معین کئے ہوئے بیلٹ کے اندر اگر میں چاہوں تو ان کو ہلاک کردوں۔''

اب اس میں ہلاک ہونے والے انسانوں کی بھی تفصیل ہے۔ وہ بھی ایک معین راستے پر چلتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کو اس طرح زندہ رکھتا ہے۔ جس طرح چاہتا ہے، انہیں موت دیتا ہے۔

"اگر میں ہلاک کروں تو ان کی فریاد کو سننے والا کوئی نہیں ہو گا، پھر چاہے چاند، سورج ہو چاہے انسان ہو اور اگر میں ان کو زندہ رکھوں تو اس وقت تک ختم نہیں ہوں گے جب تک میں نہ چاہوں۔"

یہاں بھی اس پرزم کی تفصیل ہے۔ آخری اشارہ اسی پرزم کی طرف ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر ذرے میں زندگی ہے۔

غیب

اللہ تعالیٰ سورۃ البقرہ میں ارشاد فرماتا ہے:

"یومنون بالغیب"

"جو ایمان لائے ہیں بغیر دیکھے۔"

اللہ تعالیٰ کے لئے تو کچھ بھی غیب نہیں ہے۔ یہ غیب بندوں کے لئے ہے اور بندوں کی تفصیل میں غیب کی تفصیل ہے۔ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور جنہیں انسان کے ذہن میں ڈال دیا ہے۔ اور انسانوں کے دلوں میں ان چیزوں کے لئے رغبت پیدا کر دی۔ اس لئے انسان ان کی ایجاد کر لیتا ہے۔ پھر چاہے ایجاد میں کتنی ہی محنت کرنی پڑے اور جب نتیجہ تک پہنچتا ہے تو خوش ہو جاتا ہے اور دوسروں کے لئے یہ سبق چھوڑ جاتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح جو چیزیں غیب ہیں اور غیب سے انسانوں کے خیالوں میں آتی ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح ایجاد کر لیں۔ پھر چاہے وہ ایجاد کتنی ہی خوفناک ہو اس کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو عام عقل کے علاوہ ایک خاص عقل بھی دیتا ہے جو اس چیز کی طرف ان کا دھیان کھینچتی ہے جنہیں اللہ صورت شکل دینا چاہتا ہو۔

آخر ایک نہ ایک دن وہ اس چیز کو پا لیتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے ہیں اور پرزم کے ذریعہ ہی اللہ تعالیٰ نعمتیں نازل کرتا ہے۔ آیت نمبر 22 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"جس نے آپ کے لئے زمین کو بستر اور آسمان کو عمارت بنا دیا۔"

یعنی آسمان کو عمارت کی شکل بنا دی جو ظاہری طور پر نظر نہیں آتی ہے مگر یہ بہت بڑی تعمیر ہے۔ جس میں ستارے اور سیارے اپنی اپنی بیلٹ پر چل رہے ہیں۔ یہ بیلٹ ہمارے علم سے باہر ہے مگر یہ وہی بیلٹ ہے جو آسمان کو عمارت کی شکل دیتا ہے۔ یہاں عمارت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ عمارت سے مراد انسان بھی ہے۔ دریا اور پہاڑ بھی ہیں، اڑنے والے پرندے بھی ہیں اور ان کی جبلت،

ضروریات، خواص، کیفیات وغیرہ سب لفظ ''عمارت'' میں آجاتا ہے۔ یعنی کہ اللہ نے اتنی مخلوق بنادی ہے جن کی ہم گنتی نہیں کر سکتے۔ اور یہی مخلوق اس کی تعمیر ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس مخلوق کے لئے فرماتا ہے کہ:

''میں نے اس مخلوق کیلئے زمین کو بستر بنایا اور آسمان کو عمارت بنادیا ہے۔''

ہم کبھی ان باتوں کے بارے میں سوچتے نہیں ہیں اگر ذرا بھی تفکر کریں تو احساس ہو گا کہ یہ سب پرزم کی کاریگری ہے جس کی تفصیل میں نے کہی ہے۔ آگے چل کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''نافرمان لوگ ان چیزوں کو توڑتے ہیں جن کو جوڑنے کا میں نے حکم دیا ہے اور فساد کرتے ہیں۔ کبھی وہ لوگ سوچتے نہیں کہ یہ انہیں کا نقصان ہے وہ میرا کچھ نقصان نہیں کرتے۔ اگر وہ سوچیں تو یہ وہ نقصان ہے جو پرزم کی کاریگری کو بگاڑنا چاہتا ہے۔''

حقیقت میں وہ بگڑتی نہیں ہے بلکہ اسی حالت میں رہتی ہے، جس حالت میں اسے رکھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ آیت نمبر 31 میں فرماتا ہے:

''میں نے آدم کو سب نام سکھائے اور وہ بتائے فرشتوں کو کہا بتاؤ مجھے وہ نام اگر سچے ہو، فرشتوں نے کہا تو برتر ہے، ہمیں معلوم نہیں، مگر وہ جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو جاننے والا ہے۔''

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''کہا اے آدم! بتادے نام ان کو پھر جب اس نے انہیں نام بتادیئے تو کہا کیا میں نہ کہتا تھا کہ مجھے زمین و آسمان کی خبر ہے اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو اس کی بھی خبر ہے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ اس کائناتی پرزم کی تفصیل کرتا ہے جس میں اس نے ظاہری مخلوق اور باطنی مخلوق دونوں بنادیں ہیں۔ اگر پرزم کی یہ خاصیت نہ ہوتی تو یا تو تمام مخلوق ظاہر ہوتی یا تمام مخلوق غائب ہوتی۔ اصل زور اس آیت پر ہے کہ:

''میں نے سکھائے آدم کو سب کے سب نام اور وہ بتائے فرشتوں کو۔''

چیزیں نہیں، نام بتائے اب نام بتانے سے ہی پرزم کی ہستی ثابت ہوتی ہے۔

آیت نمبر 37 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''آدم نے اپنے رب سے بہت سی باتیں سیکھ لیں پھر ان پر تفکر کیا۔ برحق ہے وہ معاف کرنے والا۔''

آیت نمبر 63 میں اللہ فرماتا ہے:

''جب میں نے تم سے عہد لیا اور اونچا کیا تم پر پہاڑ، پکڑو جو میں نے تمہیں دیا ہے مضبوطی سے اور یاد کرتے رہو جو اس میں ہے شاید تمہیں ڈر لگتا ہو۔''

یہ بھی پر زم کی تفصیل ہے غور کرنے کے بعد یہ آیت سمجھ میں آتی ہے، غور کئے بغیر کوئی اسے سمجھ نہیں سکتا۔

آیت نمبر 66 میں اللہ فرماتا ہے:

''اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کیلئے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت بنا دیا۔''

یہ جو ڈر خوف انسان کی کیفیت میں ملتا ہے کبھی وہ کچھ سوچتا ہے اور کبھی کچھ اور جو باتیں اس کے روبرو ہیں اس سے ڈرتا ہے اور جو معاشرے کے اندر ہیں اس سے بھی ڈرتا ہے کہ اس کی پیٹھ پیچھے کیا ہونے والا ہے۔ یہ ان باتوں پر غور کرتا ہے تو نصیحت پاتا ہے اور بری باتوں سے دور رہتا ہے۔ یہ پرزم کی ہی تفصیل ہے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے آگے پیچھے وہ ڈرتا رہتا ہے۔

آیت نمبر 115 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

''اور مشرق اور مغرب سب خدا ہی کا ہے تو جدھر تم رخ کرو ادھر خدا کی ذات ہے۔ بے شک خدا صاحب وسعت اور باخبر ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ سمتوں کا انکار کرتا ہے وہ خود فرماتا ہے کہ جس طرف آپ رخ کریں گے اللہ تعالیٰ دھیان دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وسعت ہے جس نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔

آیت نمبر 116 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

''جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، سب اسی کا فرمانبردار ہے۔''

اس آیت پر غور کیا جائے تو انسان کو پرزم بتاتا ہے کہ اس کا سر آسمان کی طرف ہے اور جب وہ جھکتا ہے تو اللہ ہی کو جھکتا ہے۔ آیت نمبر 117 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

''وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

آسمان اور زمین کو اس طرح پیدا کرنے والا ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہر پل یا اس کے ہزارویں حصے میں پرزم کے اندر ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے۔ اس کے ارادے سے ہر چیز ہو جاتی ہے جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ انسان سمجھتا ہے

کہ اس کا سر آسمان کی طرف ہے اور جب وہ سر جھکاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ وہ زمین کی طرف جھکتا ہے۔ مگر یہ سب پرزم کا کرشمہ ہے۔ یہ ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے پاس کوئی سمت نہیں ہے مشرق نہ مغرب نہ شمال اور نہ جنوب، نہ اوپر نہ نیچے اس کے باوجود انسان تمام سمتوں کو دیکھتا ہے، وہ اس پرزم کے ذریعے ہی دیکھتا ہے۔